مجلس ادارت

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپیے فی شمارہ سات روپیے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس۔ ایم۔ کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

• رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

• خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن [illegible]

جلد ۱۶۱ ماہ محرم الحرام ۱۴۱۹ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۹۸ء عدد ۵

فہرست مضامین

عنوان	مصنف	صفحات
شذرات	ضیاء الدین اصلاحی	۳۲۲ - ۳۲۴
مقالات		
ابو مسلم اصفہانی کے تفسیری اقوال	محمد عارف عمری، رفیق دار المصنفین	۳۲۵-۳۴۸
سائنس میں مسلمانوں کا عروج و زوال	مولانا شہاب الدین ندوی، ناظم فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، بنگلور	۳۴۹-۳۶۵
امریکا کے بعض میوزیم کے چند قیمتی مخطوطات	پروفیسر نذیر احمد، سرسید نگر، علی گڑھ	۳۶۶-۳۸۱
شیخ الرئیس کی تفسیر سورۂ اخلاص	ڈاکٹر سید غیاث الدین ندوی، لکچرر تکمیل الطب کالج، لکھنؤ	۳۸۲-۳۸۵
اخبار علمیہ	ع۔ ص۔	۳۸۶-۳۸۷
وفیات		
مولانا شاہ عون احمد قادری	"ض"	۳۸۸-۳۹۰
مولانا ابوبکر اصلاحی	"ض"	۳۹۰-
مولانا شاہ حسن مثنیٰ ندوی	"ض"	۳۹۱-
منشی محمد حنیف صاحب	"ض"	۳۹۱-
ادبیات		
غزل	پروفیسر جگن ناتھ آزاد، گورنمنٹ کوارٹرس گاندھی نگر، جموں	۳۹۲-
مطبوعات جدیدہ	ع۔ ص۔	۳۹۳-۳۹۶

شذرات

آہ! سید شہاب الدین دسنوی!

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی میں اس کے معتمد جناب سید شہاب الدین دسنوی کی وفات کی خبر نہایت رنج و افسوس کے ساتھ سنی گئی، ۱۰ اپریل کو ان کے صاحبزادے جناب امتیاز دسنوی کا یہ تار آیا کہ "میرے ابا جان ۳۰ مارچ کو انتقال فرما گئے" اِنّا لِلّٰہِ الخ اس کی مزید تصدیق اور تعزیت کے لیے اسی روز ان کے گھر فون کیا گیا۔ اپریل کا معارف عیدالاضحیٰ کی وجہ سے پہلے ہی لکھا اور مرتب کیا جا چکا تھا اس لیے اس میں اس حادثۂ فاجعہ کی اطلاع دینے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔

وہ ۶ جولائی ۱۹۱۲ء کو بہار کے مردم خیز گاؤں دسنہ میں پیدا ہوئے شرفا و سادات کی یہی بستی علامہ شبلیؒ کے بے تکلف دوست شاہ تجمل حسین، ان کے خاص عقیدت مند مولوی عبدالحکیم اور شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی کا بھی وطن تھی اور دارالمصنفین کے وابستگان میں مولوی سید ابوظفر ندوی، پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمن بھی اسی سرزمین کے لعل و گہر تھے۔

سید شہاب الدین دسنوی صاحب کی ابتدائی تعلیم دسنہ کے مدرسۃ الاصلاح میں ہوئی مونگیر سے میٹرک کیا۔ وہاں ان کے والد بزرگوار جناب سید ارادت حسین صاحب سرکاری ملازم تھے، بہار نیشنل کالج پٹنہ سے انٹرمیڈیٹ اور سینٹ زیویرس کالج کلکتہ سے بی۔ ایس سی کیا، اس وقت ان کے ماموں سید نجیب اشرف صاحب اسمٰعیل کالج بمبئی میں اردو کے لکچرر تھے، انکے ایک صاحبزادے کو ٹائیفائڈ ہوگیا تو انہوں نے ان کی تیمارداری کے لیے تار دیکر اپنے بھانجے کو بمبئی بلایا، یہ بمبئی گئے تو پھر وہیں کے ہو رہے اور اپنا علم و ہنر اور لیاقت و قابلیت سب اسے

نثار کر دیا، پہلے انجمن اسلام ہائی اسکول میں ٹیچر پھر اس کے پرنسپل ہوئے اور آٹھ نو برس بعد صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ کے پرنسپل ہوگئے اور عرصۂ دراز تک انجمن کے اعزازی جنرل سکریٹری رہے، صابو صدیق کی از سر نو تنظیم کرکے اسے زیادہ مفید اور موثر بنانے کی جد و جہد کرتے رہے، ان کے زیر اہتمام ۱۹۶۱ء میں اس کی سلور جبلی دھوم دھام سے منائی گئی، غرض ان کی محنت، کارگزاری، خوش انتظامی اور سلیقہ مندی نے ان اداروں کو بڑا متحرک اور انہیں بہت نیک نام بنا دیا تھا۔ ۱۹۶۱ء میں حکومت ہند کی وزارت تعلیم نے منتخب اساتذہ کو نیشنل ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا تو مہاراشٹر کی فہرست میں مسلمانوں میں تنہا ان کا نام تھا۔ اس کے ۵۰۰ روپے انہوں نے انجمن ہی کو نذر کر دیے تھے کیونکہ اسی کی بدولت یہ اعزاز ملا تھا، ۱۹۸۶ء میں انجمن کی صد سالہ تقریب کے موقع پر اس کی تاریخ لکھنے کا کام انہیں سپرد ہوا، جس کے وہ بڑے واقف کار تھے۔

ان میں بڑی قوت عمل تھی اور وہ اچھی تنظیمی صلاحیت کے مالک تھے، پروگرام اور منصوبوں کی تشکیل، جلسوں کے ایجنڈے، نظام الاوقات کی ترتیب اور اداروں کے بجٹ بنانے وغیرہ کے ماہر تھے، ان کا یہ جوہر طالب علمی ہی کے زمانے سے کھلنے لگا تھا۔ پٹنہ بی۔ این۔ کالج میں "بزم اردو" قائم کی اور ایک اچھا اور بڑا مشاعرہ کرایا، اسی زمانے سے تقریری مقابلوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ سینٹ زیویرس کالج کلکتہ میں اردو لٹریری سوسائٹی قائم کی جس کے ماتحت تحریری و تقریری مقابلے کراتے، کلکتہ میں مسلمانوں کے ادبی و ثقافتی مرکز مسلم انسٹی ٹیوٹ کے اورینٹل سیکشن کے ناظم ہوئے اور اس کے جلسۂ میلاد میں مولانا ابوالکلام آزاد کو تقریر کے لیے مدعو کیا۔ ان کی باقاعدہ عملی زندگی اور سرگرمیوں کا آغاز بمبئی میں ہوا، یہاں کی اکثر ادبی و ثقافتی تقریبات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ اکثر ادبی، تعلیمی اور ثقافتی کمیٹیوں کے

رکن بھی تھے اور اپنی تنظیمی اور منصوبہ سازی کی صلاحیت کی وجہ سے نیم مردہ اداروں اور تحریکوں میں جان ڈال دیتے تھے، تعلیم بالغان کی غیر سرکاری کمیٹی کے وہ ۱۹۵۳ء میں ممبر ہوئے تو مدرسین کے سامنے بالغوں کی نفسیات اور طریقۂ تعلیم پر لکچر دینے اور وقتاً فوقتاً کلاسوں کا معائنہ کرنے کا کام ان کو سپرد ہوا، اس کے لیے اردو کا قاعدہ لکھا، ایک پندرہ روزہ اخبار "رہبر" بھی اس مہم کو کامیاب بنانے کے لیے جاری ہوا جس کی عملاً ادارت انھوں نے اپنے رفیق کار عبدالرزاق قریشی مرحوم کے تعاون سے انجام دی۔ ۵۹ء میں ریاستی حکومت نے ٹکنکل اداروں کے ملازمین کی تنخواہوں کے گریڈ اور ان کے لیے قواعد و ضوابط مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی جس کے وہ چیرمین تھے، آزادی کے بعد جمعیۃ علمائے ہند کے زیر اہتمام مولانا حفظ الرحمن صاحب نے بمبئی میں آل انڈیا تعلیمی کنونشن کرایا تو اس میں بھی پیش پیش رہے، جمعیۃ کے کل ہند اجلاس سورت میں بھی شریک ہوئے اور مفید تجویزیں پیش کیں، بمبئی کی انتخابی اور سیاسی سرگرمیوں سے بھی سروکار رکھتے، انجمن کے عہدہ دار ہونے کی وجہ سے کسی خاص پارٹی سے وابستہ ہونا ان کے لیے ممکن نہیں تھا تاہم اچھے اور مناسب امیدواروں کی انتخابی مہم کی ساری ذمہ داری اپنے سر لے لیتے تھے۔ ایک بار وہ خود بھی بمبئی میونسپل کارپوریشن کے ایک ضمنی الیکشن میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوئے اور کامیاب ہوئے، دوبارہ پھر انتخابی دنگل میں کودے اور پورے پانچ برسوں کے لیے ممبر منتخب ہوئے، اس عرصہ میں وہ کارپوریشن کی تعلیمی کمیٹی اور ریسرچ یونٹ کے ممبر کی حیثیت سے مفید خدمات انجام دیں۔

ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ ان کے کانوں میں دارالمصنفین کا نام گونجنے لگا تھا، مولانا سید سلیمان ندوی ناظم دارالمصنفین اور ان کے ماموں سید نجیب اشرف ندوی کے علاوہ ان کے ہم وطن مولانا سید ابوظفر ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب اس سے وابستہ تھے، سید صاحب کے خواجہ تاشوں میں مولانا عبدالسلام ندوی اور مولوی مسعود علی ندوی بھی خاص متوسل یہ دسنہ جایا کرتے تھے اس لیے دارالمصنفین سے انکو بڑا قلبی لگاؤ تھا اور کبھی کبھی یہاں تشریف بھی لاتے تھے، بعد میں وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے بڑے سرگرم ممبر بھی ہوگئے، ان کی اور بعض دوسرے قدر دانوں کی دعوت پر سید صاحب نے بمبئی میں "عربوں کی جہاز رانی" پر لکچر دیا۔ ۱۹۶۵ء میں دارالمصنفین کی گولڈن جبلی منائی گئی، اس کے اخراجات کی فراہمی کے لیے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمن صاحبان نے بمبئی کا سفر کیا تو انھوں نے اور خصوصاً منشی عبدالعزیز انصاری رکن دارالمصنفین نے اس وفد کی بڑی پذیرائی کی، ۷۲ء میں دارالمصنفین کی مالی حالت بہتر بنانے کے لیے اس کا جلسۂ انتظامیہ بمبئی میں ہوا، اس موقع پر بھی ان کی اور منشی جی مرحوم کی کوششوں سے متعدد حضرات دارالمصنفین کے لائف ممبر بنے، شہاب صاحب انجمن سے سبکدوش ہوئے تو صباح الدین صاحب نے چاہا کہ وہ دارالمصنفین کے انتظامی امور کو سنبھال لیں، ان کی زندگی میں تو وہ اس کے لیے اپنے کو فارغ نہیں کر سکے مگر ان کی وفات کے بعد ۸۷ء میں وہ اس کے انتظامی امور کے معتمد مقرر ہوئے تو چندے یہاں قیام کیا مگر جلد ہی اپنی پیرانہ سالی اور خانگی ضرورتوں کی وجہ سے جناب عبدالمنان ہلالی کو اپنا قائم مقام بنا کر پٹنہ چلے گئے، ادھر کئی برس سے ان کی معذوری اتنی بڑھ گئی تھی کہ سفر کرنا ممکن نہ تھا، اس لیے دارالمصنفین کے جلسوں میں شریک ہونا اور اعظم گڈھ آنا جانا موقوف ہو گیا تھا۔ تاہم خط و کتابت اور فون سے ہم لوگوں کا رابطہ قائم رہتا اور ہم ان کے تجربوں، مشوروں اور ہدایات سے فائدہ اٹھاتے، ان کی موجودگی بڑی تقویت کا باعث اور سہارا تھی، افسوس اب یہ سہارا بھی ختم ہو گیا۔

ان کی دلچسپی اور سرگرمی کا ایک میدان انجمن ترقی اردو بھی تھا، اس کی وجہ سے وہ پوری اردو دنیا میں روشناس تھے، ان کی اور بعض دوسرے مخلصین کی کوشش سے ۱۹۴۴ء میں انجمن کی

شاخ بمبئی میں قائم ہوئی جس کے وہ جنرل سکریٹری چنے گئے، انہوں نے انجمن کو سرگرم بنانے کے لیے اردو کانفرنس اور آل انڈیا مشاعرہ کا انعقاد کرایا، ۱۹۵۱ء میں انجمن ترقی اردو ہند کا دفتر علی گڑھ میں تھا اور قاضی عبدالغفار مرحوم اس کے سکریٹری تھے، اسی زمانے میں ان کا اس سے تعلق ہوا، وہ اس کے حیاتی رکن اور متعدد ذیلی کمیٹیوں کے ممبر تھے۔ انجمن کے موجودہ جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کے وہ خاص دست راست تھے، مالیاتی کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے وہی انجمن کا سالانہ بجٹ بنا کر مجلسِ عام میں پیش کرتے، ۱۹۸۳ء میں وہ اس کے نائب صدر ہوئے، انجمن سے اتنا گہرا تعلق تھا کہ اس کے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے اور کبھی ناغہ نہیں کرتے۔

انہوں نے کئی بیرونی ملکوں کی سیاحت بھی کی، کہیں لکچر دینے اور کہیں مقالہ پڑھنے کے لیے مدعو کیے گئے، ۱۹۵۲ء میں امریکا کا تعلیمی سفر کیا، واشنگٹن جاتے ہوئے طہران، قاہرہ، ایتھنس، روم، سوئزرلینڈ، پیرس، لندن اور نیویارک کی بھی سیاحت کی۔ ۷۹ء میں آسٹریلیا گئے اور میلبورن میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر کچھ لکچر دیے، اسی ضمن میں میلبورن یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات و عربی میں بھی اسلام پر ایک لکچر دیا۔ ۸۵ء میں ترکی کا سفر کیا اور استنبول کے ایک سیمنار میں مقالہ لکھا، اپنے بعض اعزہ، اکلوتی بہن اور بیٹی سے ملنے پاکستان گئے، ۱۹۷۰ء میں حج و زیارت کے لیے حرمین شریفین میں حاضری دی۔

بمبئی کو خیرباد کہہ کر دسنوی صاحب مستقل رہایش کے لیے پٹنہ آئے تو یہاں کی تعلیمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا لازمی جز ہو گئے، میں خدا بخش لائبریری پٹنہ کے سیمناروں میں جاتا تو وہاں ان سے ضرور ملاقات ہوتی، بہار اردو اکاڈمی کے وائس چیرمین ہوئے تو دسمبر ۸۴ء میں فخر بہار علامہ سید سلیمان ندوی پر ایک اچھا اور باوقار سیمنار کرایا، بعض دوسرے ادیبوں اور شاعروں پر بھی سیمنار کرائے، اس سے کچھ پہلے انہوں نے حکیم عبدالحمید صاحب متولی ہمدرد دواخانہ

کی خواہش پر ہمدرد کے ایڈمنسٹریٹر کی ذمہ داری قبول کر کے اس کی خدمت کی۔

دسنوی صاحب کا زیادہ وقت علمی و تعلیمی کاموں کی نگرانی اور تعلیم گاہوں اور اداروں کے انتظام و انصرام میں گزرا، اس لیے انہیں تصنیف و تالیف کا موقع کم ملا لیکن علم و مطالعہ سے شغف اور تقریر و تحریر کا اچھا سلیقہ تھا، وقتاً فوقتاً اردو اور انگریزی اخباروں میں مضامین لکھتے، درس و تدریس کے پیشہ سے وابستگی کی وجہ سے انہوں نے چند درسی کتابیں لکھیں، جن میں "بچوں کا قاعدہ" اور "ہمارا دین" بہت مقبول ہیں، یہ کتابیں بڑی محنت اور دماغ سوزی سے لکھی گئی ہیں، اول الذکر مہاراشٹر کے پرائمری اسکولوں میں داخلِ نصاب تھی اور موخر الذکر کو ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی نے شایع کیا اور مراٹھی اور گجراتی میں اس کے ترجمے ہوئے۔ کانجی دوارکاداس نے ہندوستان کی جنگ آزادی پر انگریزی میں دو جلدوں میں ایک کتاب لکھی تھی، دسنوی صاحب نے اس کے ان حصوں کو بہت مربوط طریقے سے یکجا کر کے اردو کا جامہ پہنایا ہے، جو محمد علی جناح سے متعلق تھے، "کیمیا کی کہانی" اور "آئن اسٹائن کی کہانی" معلومات افزا اور عام فہم کتابیں ہیں، "شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں" لکھ کر انہوں نے شبلوی ہونے کا حق ادا کیا ہے، انجمن کے "سو سال"، سیرت لکچر (انگریزی) کے علاوہ "دیدہ و شنیدہ" کے نام سے اپنے خودنوشت حالات لکھے ہیں جو دلچسپ اور سبق آموز ہیں، ان کے چھ افسانوں کا مجموعہ "پہلو بہ پہلو" بھی چھپا ہے، ان میں سے اکثر کتابوں پر ایوارڈ بھی مل چکا ہے، وہ بڑی سلیس، شگفتہ اور حشو و زوائد سے پاک اردو لکھتے تھے۔

شہاب الدین صاحب ایک باغ و بہار اور مرنجاں مرنج شخص تھے، شکل و صورت بڑی پاکیزہ تھی، نکلتا قد، گورا رنگ، پہلی ہی نظر میں آدمی ان سے متاثر ہو جاتا، گفتگو

بہت میٹھے، نرم اور دھیمے لہجے میں کرتے اور اس میں بڑی تاثیر اور جاذبیت ہوتی، تحریر و تقریر دونوں میں اپنا مدعا بڑی خوبصورتی اور سلیقہ سے پیش کرتے، جلسوں اور میٹنگوں میں اپنے خیالات نپے تلے انداز میں مناسب طور سے رکھتے، انہیں دوسروں کو متاثر کرنے اور اپنی باتیں منوا لینے کا خاص ملکہ تھا، وہ بااصول آدمی تھے، اس معاملہ میں رورعایت نہ کرتے، اس کی اور ذمہ دار عہدوں پر فائز رہنے کی وجہ سے انکے بعض ماتحتوں کو ان سے شکایت رہتی تھی، ان کی نشست و برخواست ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ رہتی تھی۔ مذہبی لوگوں کی طرح ادیبوں، شاعروں اور ترقی پسندوں سے بھی گھلے ملے رہتے تھے، چنانچہ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم لکھتے ہیں "یہ شہاب صاحب آدمی بڑے کارگزار ہیں اور ہر طبقہ میں صاحب رسوخ اِدھر آرٹ نوازوں میں شامل، اُدھر ہم دقیانوسی سے واصل۔ باما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد کو اپنا دستور العمل بنائے" بعض خشک اور متقشف لوگوں کو ان کی یہ رعنائی خیال پسند نہیں تھی اور وہ ان پر نکتہ چینی کرتے تھے، ان کا مذہبی مطالعہ وسیع تھا، دینی لٹریچر اور قرآن مجید کے اردو اور انگریزی ترجمے ہمیشہ ان کے مطالعہ میں رہتے تھے، اکثر ان مسائل پر سوالات اور گفتگو بھی کرتے تھے، صوم و صلوٰۃ کے بڑے پابند تھے، حج بیت اللہ کی سعادت بھی میسر آئی تھی، مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے بڑے مداح تھے، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے بھی قربت تھی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بڑے غالی معتقد تھے، ان میں بڑا ضبط و تحمل بھی تھا، اپنے اوپر تنقید کو برداشت کر لیتے، کوئی سخت سُست کہتا تب بھی غضبناک اور مشتعل نہ ہوتے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور بشری لغزشوں سے درگزر کرے۔ آمین!!

مقالات

ابومسلم اصفہانی کے تفسیری اقوال

از۔ مولوی محمد عارف عمری۔ رفیق دارالمصنفین

(۲)

وصیت ازواج کے حکم کا نسخ اور ابومسلم کی تاویل

اوپر ذکر آچکا ہے کہ ابومسلم اصفہانی قرآن مجید میں نسخ کو سرے سے نہیں مانتے، یقیناً ان کی یہ رائے جمہور مفسرین کے متفقہ مسلک کے برخلاف ہے تاہم انہوں نے ان تمام آیتوں کے مابین جن کو مفسرین نے ناسخ و منسوخ بتایا ہے، تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس موضوع پر انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کی بے نظیر خداداد ذہانت کا پتہ چلتا ہے۔ یہاں صرف اس کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

سورۂ بقرہ کی درج ذیل آیت کے بارہ میں مفسرین کا خیال ہے کہ اس میں متوفی کی جانب سے اس کی ازواج کے لیے ایک سال کے نفقہ و سکنی کی وصیت کا حکم ہے اور یہ حکم بعد کو منسوخ ہوگیا۔ وہ آیت یہ ہے:

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ
أَزْوَاجًا وَّصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا إِلَى
الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ فَإِنْ خَرَجْنَ
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْ

اور جو لوگ تم میں سے مر جاویں اور چھوڑ جاویں اپنی عورتیں تو وہ وصیت کر دیں اپنی عورتوں کے واسطے خرچ دینا ایک برس تک بغیر نکالنے کے گھر سے۔ پھر اگر

اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَعْرُوْفٍ۔	وہ عورتیں آپ نکل جاویں تو کچھ گناہ نہیں
(بقرہ ۲: ۲۴۰)	تم پر اس میں کہ کریں وہ عورتیں اپنے
	حق میں بھلی بات۔

عام مفسرین کے نزدیک ابتداءً یہی حکم تھا کہ قریب الموت شخص اپنی بیوی کے لیے یہ وصیت کرجائے کہ وہ ایک سال تک اس کے گھر میں رہے اور اس کو اس کے ترکہ سے نان و نفقہ دیا جاتا رہے۔ مگر جب سورۂ بقرہ کی درج ذیل آیت میں عدت کا حکم نازل ہوگیا۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ	اور جو لوگ مرجاویں تم میں سے اور چھوڑ
اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ	جاویں اپنی عورتیں تو چاہیے کہ وہ عورتیں
اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا۔	انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو چار مہینے
(بقرہ ۲: ۲۳۴)	اور دس دن۔

تو اس وقت سے یہ پابندی ختم ہوگئی کہ عورت اپنے سابق شوہر کے گھر میں ایک برس پڑی رہے۔ پھر جب میراث کا حکم نازل ہوا اور اس میں عورتوں کا بھی حصہ متعین کردیا گیا کہ

وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ	اور عورتوں کے لیے چوتھائی مال ہے
لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ فَاِنْ كَانَ	اس میں سے جو چھوڑ مرو تم اگر نہ ہو
لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا	تمہارے اولاد اور اگر تمہارے اولاد
تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ	ہے تو ان کے لیے آٹھواں حصہ ہے۔
بِهَآ اَوْ دَيْنٍ۔	اس میں سے کہ جو کچھ تم نے چھوڑا بعد
(نساء ۴: ۱۱۲)	وصیت کے جو تم کر مرو یا قرض کے۔

تو ایک برس کے لیے نان و نفقہ کی وصیت کا حکم بھی ساقط ہوگیا۔

ف

ابو مسلم اصفہانی نے جمہور کے اس متفقہ مسلک کے برخلاف حکم وصیت کی تاویل یوں کی ہے:

ان معنی الآیة من یتوفی منکم	آیت کا مطلب یہ ہے کہ مرنے والے شخص
ویذرون ازواجا وقد	نے اگر اپنی بیوی کے لیے ایک سال کے
اوصوا وصیة لازواجهم	نان و نفقہ اور سکنیٰ کی وصیت کر رکھی ہو
بنفقة الحول وسکنی الحول	اور عورت اس مدت کی پابندی نہ کرے
فان خرجن قبل ذلک وخالفن	بلکہ عدت کی مدت گزار لینے کے بعد بھلے طریقہ
وصیة الزوج لبعد ان یقمن	سے نکاح کرلے تو کوئی حرج کی بات نہیں
المدة التی ضربها الله تعالیٰ	ہے کیونکہ شوہر کی اس وصیت کو پورا کرنا
لهن فلا حرج فیما فعلن فی	اس کے لیے لازم نہیں ہے، چونکہ زمانہ
انفسهن من معروف ای نکاح	جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ مرنے والا
صحیح لان اقامتهن بهذه الوصیة	اپنی بیوی کے لیے ایک سال کے نفقہ اور
غیر لازمة والسبب انهم کانوا	سکنیٰ کی وصیت کرجاتا تھا اور عورت کو
فی زمان الجاهلیة یوصون	سال بھر اس کے گھر میں بطور عدت بیٹھنا
بالنفقة والسکنی حولاً کاملاً	پڑتا تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں
وکان یجب علی المرأة الاعتداد	یہ بیان کیا ہے کہ اس قسم کی وصیت کی
بالحول فبین الله تعالیٰ فی	پابندی غیر ضروری ہے اور اس تاویل
هذه الآیة ان ذلک غیر	کے مطابق نسخ کا مسئلہ بھی زائل ہوجاتا ہے۔
واجب وعلی هذا التقدیر	

فالنسخ زائل[1]

علامہ ابن کثیر نے ابومسلم کے نقطۂ نظر کی تردید کی ہے اور جمہور کے موقف کو درست بتلایا ہے۔[2] جس کی تائید میں ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی درج ذیل روایت نقل کی ہے۔

کان الرجل اذا مات وترک	آدمی جب مرتا تھا اور اپنے پیچھے بیوی چھوڑ
امرأته اعتدت سنة فی	جاتا تھا تو وہ عورت اس کے گھر میں ایک
بیته ینفق علیها من ماله	سال عدت گزارتی تھی اور اس کا نفقہ
ثم انزل الله من بعد	مرنے والے شوہر کے مال سے پورا کیا جاتا
وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ	تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آیت عدت نازل
وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا یَّتَرَبَّصْنَ	فرمائی۔
بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ	
وَّعَشْرًا[2]	

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی مذکورہ بالا روایت میں یہ تعیین موجود نہیں ہے کہ ایک سال تک عدت گزارنے کا طریقہ اسلام کا ابتدائی حکم تھا یا زمانۂ جاہلیت سے متواتر چلا آرہا تھا۔ تاہم امام رازی نے ابومسلم کی تاویل کو غایت درجہ صحیح بتایا ہے۔[3] یہی نہیں بلکہ وہ اس تاویل کو معقول اور مدلل بتاتے ہوئے جمہور مفسرین کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ابومسلم کے قول کو اختیار کرنے کی صورت میں آیت کا مطلب بالکل واضح ہوجاتا ہے، اس آیت میں آپ لوگ یہ مقدر مانتے ہیں کہ مرنے والے پر وصیت لازم ہے یا یہ کہ

[1] ملتقط جامع التاویل، ص ۲۸، ۲۹ [2] تفسیر ابن کثیر، ج ۱ ص ۲۹۶ - [3] تفسیر کبیر ج ۲ ص ۴۲۳

اس کو وصیت کرنی چاہیے اور اس تقدیر کو آپ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یعنی اس کا حکم قرار دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف آیت میں ابومسلم نے یہ مقدر مانا ہے کہ مرنے والے کی وصیت ہو یا اس نے وصیت کر رکھی ہو۔ چنانچہ وہ وصیت کا انتساب زوج کی طرف کرتے ہیں۔

اگر آیت میں مقدر ماننا ضروری ہی ہے تو ابومسلم کے مقابلہ میں آپ حضرات کا مقدر ماننا زیادہ بہتر نہیں ہے کیونکہ آپ لوگوں کی تقدیر نسخ کو لازم قرار دیتی ہے اور اس کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ صورت کلام الٰہی کی ترتیب کے خلاف بھی ہے (یعنی آیت ناسخ پہلے اور منسوخ بعد میں ہے) جس سے کلام الٰہی کو بے داغ ہونا چاہیے۔"[1]

ابومسلم نے اس آیت کی تاویل میں مزید نکتہ آفرینی یہ کی ہے کہ جمہور کی تاویل کے مطابق بھی نسخ کے بجائے تخصیص کا پہلو نکلتا ہے، چنانچہ ان کا کہنا ہے کہ بعض مخصوص حالات میں عدت کی مدت ایک سال بھی ہوسکتی ہے مثلاً عورت حمل سے ہو اور ایک سال بعد ولادت ہو تو جب ایسی ممکنہ صورت کا وجود ہوسکتا ہے تو آیت کو تخصیص پر محمول کرنا چاہیے نہ کہ نسخ پر۔[2]

نسخ کے سلسلہ میں ابومسلم کا نظریہ گو جمہور مفسرین سے الگ ہے تاہم مولانا ابوالکلام آزاد نے آیت زیر بحث میں ابومسلم ہی کی تاویل کو اختیار کیا ہے۔ وہ اس آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگر شوہر نے وصیت کردی ہو کہ ایک برس تک عورت اس کے گھر میں رہے اور

[1] تفسیر کبیر ج ۲ ص ۴۲۳ [2] ملتقط جامع التاویل ص ۹۔

نان و نفقہ پائے (یعنی ایک سال تک سوگ منائے اور گھر سے نہ نکلے جیسا کہ عرب جاہلیت میں دستور تھا) تو ایسی وصیت اب واجب التعمیل نہیں کیونکہ وفات کی عدت چار ماہ دس دن مقرر کر دی گئی ہے۔[1]

حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ کا مفہوم طلاق مغلظہ کے بعد شوہر اور بیوی کے درمیان دائمی جدائی ہو جاتی ہے دوبارہ اس عورت سے اس کا نکاح اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ کسی اور شخص کے نکاح میں نہ چلی جائے اور اس سے ہم بستر بھی ہو۔ ارشادِ باری ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۭ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ۔ (بقرہ: ۲۳۰)

پھر اگر اس عورت کو طلاق دی یعنی تیسری بار تو اب حلال نہیں اس کو وہ عورت اس کے بعد جب تک نکاح نہ کرے کسی خاوند سے اس کے سوا، پھر اگر طلاق دے دے دوسرا خاوند تو کچھ گناہ نہیں ان دونوں پر کہ پھر باہم مل جاویں۔

مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

"نکاح کا لفظ ہمارے نزدیک عقد نکاح ہی کے معنی میں ہے ..... وطی کے لیے قرآن سے کوئی ثبوت نہیں نکلتا۔"[2]

جمہور مفسرین کا یہ کہنا کہ نکاح کا لفظ اگر عقد کے معنی میں ہے تو خلوت صحیحہ کی

---

[1] ترجمان القرآن ج ۱ ص ۲۸۹ [2] تدبر قرآن ج ۱ ص ۵۳۷۔

قید سنت سے ثابت ہے مگر ابومسلم اصفہانی یہ کہتے ہیں کہ:

الامران معلومان بالكتاب[1] — دونوں ہی شرطیں یعنی نکاح نیز اور خلوت صحیحہ قرآن مجید سے ثابت ہیں۔

چنانچہ وہ آیت کی تفسیر یوں کرتے ہیں:

قوله تنكح يدل على الوطی و قوله زوجا يدل على العقد — تنکح وطی کے معنی میں ہے اور لفظ زوج خود بخود عقد نکاح کی دلیل ہے۔

امام رازی نے ابومسلم کی تاویل کو راجح بتایا ہے اور اس کی تائید میں مشہور ماہر لغت ابن جنی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اہل عرب جب نکح فلان فلانۃ کہتے ہیں تو اس سے عقد نکاح مراد ہوتا ہے اور جب نکح فلان امراتہ او زوجتہ بولتے ہیں تو جماع مراد ہوتا ہے[2]

امام آلوسی نے گو اس خیال سے اتفاق کیا ہے کہ آیت سے دونوں شرطوں کا مفہوم سمجھا جا سکتا ہے، لیکن اگر لفظ نکاح کو محض عقد ہی کے مفہوم میں لیا جائے تو آیت کو مطلق اور سنت کو اس کی مقید قرار دیا جائے گا۔[3]

مگر امام رازی نے خلوت صحیحہ کی قید محض سنت سے ثابت کیے جانے کی نفی کی ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ اس صورت میں خبر واحد نہ صرف یہ کہ قرآن مجید پر اضافہ کرتی ہے بلکہ وہ قرآن کے حکم کی ناسخ بن جاتی ہے یعنی قرآن ایک حکم کو درستگی نکاح کے لیے لازم قرار دیتا ہے اور خبر واحد سے دوسرا حکم ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

واما قول من يقول ان الآية غير دالة على الوطی — جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آیت سے وطی کا ثبوت نہیں بلکہ محض سنت سے ہے،

---

[1] ملتقط جامع التاویل ص ۲۶ [2] تفسیر کبیر ج ۲ ص ۹۲،۳۷ [3] روح المعانی ج ۲ ص ۱۴۲۔

وانما ثبت الوطی بالسنۃ فضعیف[1] — ان کی بات کمزور ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے ہو بہو ابومسلم اصفہانی اور امام رازی کے موقف کو اختیار کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"نکاح اپنے اصطلاحی شرعی معنی میں یعنی عقد نکاح کے مرادف نہیں بلکہ اپنے اصلی اور لغوی معنی میں یعنی ہم بستری کے مرادف ہے، محض عقد کا مفہوم تو خود لفظ زوجاً سے نکل آتا ہے۔ تنکح سے مقصود ہم بستری کو ظاہر کرنا تھا۔[2]

حضرت ابراہیمؑ اور احیائے موتی سورۂ بقرہ میں حضرت ابراہیمؑ کا یہ واقعہ مذکور ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ	اور یاد کر جب کہا ابراہیم نے اے
كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى قَالَ اَوَلَمْ	پروردگار میرے دکھلادے مجھ کو کہ
تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّیَطْمَئِنَّ	کیونکر زندہ کرے گا تو مردے۔ فرمایا
قَلْبِیْ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ	کیا تونے یقین نہیں کیا، کہا کیوں نہیں
الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ	لیکن اس واسطے چاہتا ہوں کہ تسکین
اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ	ہوجائے میرے دل کو۔ فرمایا تو پکڑ لے
جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ	چار جانور اڑنے والے پھر ان کو ہلالے
سَعْیًا وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ	اپنے ساتھ پھر رکھ دے ہر پہاڑ پر
حَكِیْمٌ۔ (بقرہ: ۲۶۰)	ان کے بدن کا ایک ایک ٹکڑا پھر ان کو
	بلا چلے آویں گے تیرے پاس دوڑتے
	اور جان لے کہ بیشک اللہ زبردست

[1] تفسیر کبیر ج ۲ ص ۳۰۹ [2] تفسیر ماجدی ج ۱ ص ۴۳۳۔

ہے حکمت والا۔

آیتِ بالا کی تفسیر میں تمام مفسرین متفق اللفظ ہیں کہ حضرت ابراہیم نے چاروں پرندوں کو ذبح کرکے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کیے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وہ پرندے زندہ کیے گئے۔ مگر ابومسلم نے اس واقعہ کو تمثیل بتایا ہے اور آیت کا معنی یہ بتایا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جب احیاء موتی کا منظر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس مثال کے ذریعہ سمجھایا کہ اگر تم چار پرندوں کو اپنے سے خوب مانوس کرلو پھر ان کو الگ الگ پہاڑ پر چھوڑ دو اور انکو بلاؤ تو وہ تمہارے پاس دوڑتے چلے آئیں گے، اسی طرح جب ہم روحوں کو بلائیں گے تو وہ دوڑتی ہوئی جسموں میں داخل ہوجائیں گی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

والغرض منہ ذکر مثال	ایک حسی مثال کے ذریعہ ارواح کا
محسوس فی عود الارواح	بسہولت جسموں میں دوبارہ لوٹ
الی الاجساد علی سبیل السھو[1]	آنے کو بتانا مقصود ہے۔

ابومسلم فرماتے ہیں کہ آیت کے کسی لفظ سے پرندوں کے ذبح کرنے اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کا ثبوت نہیں ملتا۔ کیونکہ فعل صار یصور جس کا امر صُرْھُنَّ ہے جب الیٰ کے صلہ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ہلانے اور مانوس کرنے کے ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کو ان پرندوں کے متعلق آواز دینے یا بلانے کے لیے جو ضمیر (ھن) استعمال ہوئی ہے اس کا مرجع طیور ہی ہو سکتے ہیں نہ کہ ان کے متفرق اجزاء اگر قطع شدہ اجزاء کو بلانا مقصود ہوتا تو اس کے لیے ضمیر واحد مونث

[1] ملتقط جامع التاویل ص ۳۲۔

ھا استعمال کی جاتی ہے[1]

امام رازی نے ابو مسلم کی اس تاویل کو جمہور مفسرین کے خلاف بتایا ہے اور اس کا جواب یہ دیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جو اشکال تھا وہ احیاء موتی کے بارہ میں تھا۔ چنانچہ ان کے اطمینان قلب کے لیے جو منظر ان کو دکھایا گیا وہ احیاء موتی کا ہی واقعہ رہا ہوگا، اس لیے پرندوں کے ذبح کی بات تسلیم کرنی ہی پڑے گی[2]

امام آلوسی نے ابو مسلم کی تاویل کو یاوہ گوئی اور ہذیان بتایا ہے[3]

مگر متاخر مفسرین نے ابو مسلم کے اس اشکال کو تسلیم کیا ہے کہ پرندوں کو ذبح کرنے کی تصریح قرآن مجید میں نہیں ہے، مولانا عبد الماجد دریابادی لکھتے ہیں:

"فصرهن کے آگے اتنی عبارت محذوف مانی گئی ہے کہ اپنے سے ہلا چکنے کے بعد ان پرندوں کو ذبح کرکے ان کے ٹکڑے پہاڑوں پر رکھ دیجئے"[4]

مولانا امین احسن اصلاحی نے بھی یہ اعتراف کیا ہے کہ پرندوں کے ٹکڑے ٹکڑے کردینے کے معنی میں کوئی خاص لفظ استعمال نہیں ہوا ہے[5]

اور مولانا آزاد نے تو بعینہ ابو مسلم ہی کی تاویل قبول کرلی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"پرندوں میں سے چار جانور پکڑ لو اور انہیں اپنے پاس رکھ کر اپنے ساتھ ہلا لو (یعنی اس طرح ان کی تربیت کرو کہ وہ اچھی طرح تم سے ہل جائیں) پھر ان چاروں میں سے ہر ایک کو اپنے سے دور ایک پہاڑ پر بٹھا دو پھر انہیں بلاؤ وہ آواز سنتے ہی تمہاری طرف اڑتے ہوئے چلے آئیں گے"[6]

مولانا آزاد نے بھی ابو مسلم کے طرز پر اس واقعہ کو تمثیل کے معنی میں لیا ہے مگر اس کی

۱ ملتقط جامع التاویل ص ۳۲ ۲ تفسیر کبیر ج ۲ ص ۲۹۴، ۲۹۵ ۳ روح المعانی ج ۲ ص ۱۲۲ ۴ تفسیر ماجدی ج ۱ ص ۳۹۳ ۵ تدبر قرآن ج ۱ ص ۶۰۷ ۶ ترجمان القرآن ج ۱ ص ۲۹۸۔

تشریح میں ابو مسلم کا تتبع کرنے کے بجائے جدت و ابتکار سے کام لیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"حضرت ابراہیمؑ کا ظہور ایک ایسے عہد میں ہوا تھا جبکہ ان کے ملک میں اور ان کے ملک سے باہر کوئی گروہ بھی ایسا نہ تھا جس میں قبولیت حق کی استعداد دکھائی دیتی ہو، یہ حالت دیکھ کر انہوں نے کہا خدایا تو کیونکر اس موت کو زندگی سے بدل دیگا، اس پر اللہ نے دعوت حق کی انقلاب انگیز حقیقت پرندوں کی مثال سے واضح کردی۔ اگر تم ایک پرند کو کچھ دنوں تک اپنے پاس رکھ کر ایسا تربیت یافتہ بنا سکتے ہو کہ تمہاری آواز سنتا اور تمہارے بلانے پر اڑتا ہوا آجا سکتا ہے تو کیا گمراہ اور متوحش انسان دعوت حق کی تعلیم و تربیت سے اس درجہ اثر پذیر نہیں ہوجا سکتے کہ تمہاری صدائیں سنیں اور اس کا جواب دیں"[1]

ابو مسلم کے اس اشکال کے جواب میں کہ قرآن مجید میں ذبح کی تصریح موجود نہیں ہے، مفسرین نے یہ استدلال کیا ہے کہ آیت میں جزء کو پہاڑ پر رکھنے کا حکم دیا گیا ہے جو ذبح کا واضح قرینہ ہے، کیونکہ ذبح کے بغیر جزء کا مفہوم ممکن نہیں ہے، چنانچہ مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

"جزءاً کا جو لفظ آیا ہے وہ واضح قرینہ اسی بات کا ہے کہ ان کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہی پہاڑوں پر ڈالنے کی ہدایت ہوئی تھی"[2]

مگر ابو مسلم نے جزء کی تاویل ایسی کی ہے جس سے اس کا اشکال بجنسہ باقی رہتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

۱ ترجمان القرآن ج ۱ ص ۲۹۸ ۲ تدبر قرآن ج ۱ ص ۶۰۷۔

انه تعالیٰ اضاف الجزء الی — اللہ تعالیٰ نے لفظ جزء کی اضافت
الاربعة فیجب ان یکون — پرندوں کی تعداد کی طرف کی ہے۔
المراد بالجزء هو الواحد — چنانچہ جزء سے مراد ایک ہے، یعنی
من تلک الاربعة [1] — چاروں پرندوں میں سے ایک ایک۔

ابومسلم ہی کے اس اشکال کو بنیاد بنا کر مولانا جلیل احسن ندوی نے اپنے ایک مضمون میں مولانا امین احسن اصلاحی پر بیجا برہمی دکھائی ہے[2] اور اسے اپنی رائے قرار دیا ہے کیا اس قدر مماثلت کو توارد پر محمول کیا جاسکتا ہے؟

حضرت حوائؑ کی تخلیق | سورۂ نساء میں حضرت حوائؑ کی تخلیق کا ذکر یوں ہوا ہے:

خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ — پیدا کیا تم کو ایک جان سے اور اسی سے
وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا۔ (نساء-۱) — پیدا کیا اس کا جوڑا۔

اس آیت کی تفسیر عام طور پر مفسرین نے یہ کی ہے کہ حضرت حوائؑ حضرت آدمؑ کی بائیں پسلی سے پیدا کی گئیں[3] مگر ابومسلم کے نزدیک اس آیت میں حضرت حوا و حضرت آدمؑ کا ہم جنس ہونا بتایا گیا ہے وہ لکھتے ہیں:

ان المراد من قوله وَخَلَقَ — خلق منها زوجها کا مطلب یہ
مِنْهَا زَوْجَهَا ای من جنسها [4] — ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت حوا کو حضرت
آدمؑ کی جنس سے پیدا کیا۔

انھوں نے اپنے مفہوم کی تائید میں درج ذیل قرآنی نظائر پیش کیے ہیں۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ — اور اللہ نے پیدا کیں تمہارے واسطے
اَزْوَاجًا۔ (نحل-۷۲) — تمہاری ہی قسم سے عورتیں۔
اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ — جو بھیجا ان میں رسول انھی میں کا

[1] ملتقط جامع التاویل ص ۴۳ [2] مضمون "تدبر قرآن پر ایک نظر" مشمولہ ماہنامہ زندگی رامپور شمارہ ۵ ص ۱۰ تا ۱۳ [3] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۴۴۸ [4] ملتقط جامع التاویل ص ۴۳۔

اَنْفُسِهِمْ (آل عمران-۱۶۴)

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ — آیا ہے تمہارے پاس رسول تم میں کا
(توبہ-۱۲۸)

امام رازی نے ابومسلم ہی کے بیان کردہ مفہوم کو راجح بتایا ہے[1] اور بالعموم مفسرین نے اس کو قبول کیا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"خلق منها زوجها کے معنی ہیں اسی کی جنس سے۔ اگرچہ اس کے معنی لوگوں نے اور بھی لیے ہیں لیکن جس بنیاد پر لیے ہیں وہ نہایت کمزور ہے۔ ہم نے جو معنی لیے ہیں اس کی تائید خود قرآن میں موجود ہے۔ سورۂ نحل میں فرمایا ہے وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ اللہ نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں، اس کے یہ معنی کوئی بھی نہیں لے سکتا کہ یہ بیویاں ہر ایک کے اندر سے پیدا ہوئیں"[2]

مولانا شبیر احمد عثمانی نے بھی اسی مفہوم کی تائید کی ہے۔ چنانچہ سورۂ نحل کی آیت مستدل بہا کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"یعنی نوع انسانی ہی سے تمہارا جوڑا پیدا کیا تاکہ الفت و موانست قائم رہے اور تخلیق کی غرض پوری ہو۔ وَمِنْ آيَاتِهِ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً"[3]

فحاشی کی سزاؤں میں تطبیق | سورۂ نساء کی درج ذیل آیت میں فحاشی کے جرم میں دی جانے

[1] تفسیر کبیر ج ۳ ص ۱۹۱ [2] تدبر قرآن ج ۲ ص ۱۷، ۱۸ مطبوعہ پاکستان [3] حاشیہ بر ترجمہ شیخ الہند ص ۳۶۳ مطبوعہ سعودیہ۔

والی سزا کا ذکر یوں ہے:

وَاللَّاتِیْ یَأْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَائِکُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا۔ (نساء - ۱۵)

اور جو کوئی بدکاری کرے تمہاری عورتوں میں سے تو گواہ لاؤ ان پر چار مرد اپنوں میں سے۔ پھر اگر وہ گواہی دیویں تو بند رکھو ان عورتوں کو گھروں میں یہاں تک کہ اٹھا لے وے ان کو موت یا مقرر کر دے اللہ ان کے لیے کوئی راہ۔

جمہور مفسرین کا خیال ہے کہ ابتداءً یہی حکم تھا کہ جن عورتوں کی بد چلنی ثابت ہو جائے ان کو تاحیات گھروں میں مقید کر دیا جائے پھر جب سورۂ نور میں زنا کا مستقل حکم نازل ہوگیا اور شریعت میں غیر شادی شدہ کے لیے اس جرم کی سزا میں سو کوڑے مارنا اور شادی شدہ کے لیے رجم کرنا متعین ہوگیا تو یہ پہلا حکم منسوخ ہوگیا، البتہ تحقیق و گواہی کا جو ضابطہ اس میں بیان کیا گیا ہے وہ علی حالہ باقی رہا۔

ابومسلم نے جمہور کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ اس آیت میں ان عورتوں کے لیے راہ مقرر کرنے کی بات کہی گئی ہے جس کا تقاضا ہے کہ ان کے لیے سہولت کی راہ ہموار ہو، جبکہ بعد کی سزا ان کو اس سے محروم کرتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

وھذا لا یصح لان ھذہ الاشیاء تکون علیھن لا لھن[1]

یہ بات اس لیے درست نہیں ہے کہ بعد کی سزائیں (رجم و جلد) ان کے لیے سہولت پیدا کرنے کے بجائے ان کو

[1] ملتقط جامع التاویل ص ۴۴، ۴۵۔

مشقت میں ڈالتی ہیں۔

ان کا دوسرا اشکال یہ ہے کہ اس آیت کے معاً بعد دوسری آیت میں پھر اسی جرم کا ذکر ہے اور وہاں پر دوسری سزا بیان ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا (نساء - ۱۶)

اور جو دو مرد کریں تم میں سے وہی بدکاری تو ان کو ایذا دو۔

ابومسلم کہتے ہیں کہ اگر دونوں جرم یکساں ہیں تو دونوں کی سزاؤں میں فرق کیوں ہے؟

مولانا امین احسن اصلاحی نے ابومسلم کے دوسرے اشکال سے تعرض کر کے اس کی توجیہ یہ کی ہے:

"یہ دو صورتوں کے لیے دو الگ الگ ہدایات ہیں، ایک صورت یہ ہے کہ بدکاری کا ارتکاب کرنے والی عورت تو مسلمانوں کے معاشرے سے تعلق رکھتی ہے لیکن اس کا شریک مرد اسلامی معاشرہ کے دباؤ میں نہیں ہے۔ ایسی صورت میں یہ ہدایت فرمائی کہ عورت کو گھر کے اندر محبوس کر دیا جائے، اس کی باہر کی آمد و شد پہ پوری پابندی عائد کر دی جائے، تا آنکہ موت اس کا خاتمہ کر دے یا اس باب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نیا حکم نازل ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ بدکاری کے دونوں فریق مسلمانوں ہی سے تعلق رکھتے ہوں ایسی صورت میں ان کو زجر و توبیخ، تحقیر و تذلیل، ڈانٹ ڈپٹ اور اصلاح کے حد تک مار پیٹ سے درست کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر وہ اس کے اثر سے توبہ کر کے اپنے چال چلن درست کر لیں تو ان سے درگزر کیا جائے۔"[1]

[1] تدبر قرآن ج ۲ ص ۳۰ مطبوعہ پاکستان۔

مولانا اصلاحی نے دو صورتوں کی تعیین کرکے بظاہر اس اشکال کو رفع کرنا چاہا ہے مگر دونوں سزاؤں میں جو فرق ہے اس کو تسلیم کرنے پر وہ بھی مجبور ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ان دونوں صورتوں پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ پہلی صورت میں احتیاط کا پہلو زیادہ شدت کے ساتھ ملحوظ ہے، دوسری صورت میں تو عورت اور مرد دونوں کو یہ موقع دیا گیا ہے کہ اگر وہ توبہ کرکے اپنے چال چلن درست کرلیں تو ان سے درگزر کرلیا جائے، لیکن پہلی صورت میں عورت کے بارے میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ اگر وہ توبہ و اصلاح کرلے تو اس پر عائد کردہ قدغن اٹھالی جائے۔"[1]

ابومسلم نے سورۂ نساء کی ان دونوں آیتوں کی جو توجیہ کی ہے اس کے مطابق فحاشی کی یہ دو الگ نوعیتوں کا ذکر ہے اس لیے ان کی سزاؤں میں تفریق قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

"پہلی آیت میں صیغۂ تانیث استعمال ہوا ہے جس کے ذریعہ یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ سزا ان عورتوں کی ہے جو آپس میں بدچلنی کی مرتکب ہوتی ہیں، ایسی عورتوں کے بارہ میں یہ حکم آیا کہ سبیل پیدا ہونے تک ان کو گھروں میں بند کردو یعنی ان کو باہم ملنے جلنے کا موقع نہ دو۔

دوسری آیت میں مذکر تثنیہ کا صیغہ آیا ہے اور اس سے دو مردوں کا ناجائز تعلق مراد ہے اور اس فعل کی سزا زجر و توبیخ اور تذلیل بتائی گئی ہے۔"[2]

ابومسلم نے اپنی بیان کردہ تاویل کی تائید میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی

۱؎ تدبر قرآن ج ۲ ص ۳۰، مطبوعہ پاکستان ۲؎ ملتقط جامع التاویل ص ۴۴۔

نقل کرکے یہ ثبوت فراہم کردیا ہے کہ فحاشی کی الگ الگ قسموں پر بھی لفظ زنا کا اطلاق درست ہے[1] وہ روایت یوں ہے:

اذا اتی الرجل الرجل فهما زانیان واذا اتت المرأة المرأة فهما زانیتان۔

اگر مرد مرد سے آلودہ ہو تو دونوں زانی ہیں اور اگر عورت عورت سے تو وہ دونوں زانیہ ہیں۔

ابومسلم کی اس توجیہ پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے سخت تنقید کی ہے۔ مگر یہ تنقید اس لیے باوزن نہیں رہ جاتی کہ اس میں اس کے اشکال سے سرے سے تعرض نہیں کیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"تعجب ہے ابومسلم جیسے ذی علم شخص کی نظر اس حقیقت کی طرف کیوں نہ گئی کہ قرآن انسانی زندگی کے لیے قانون و اخلاق کی شاہراہ بناتا ہے، رہیں گلیاں اور پگڈنڈیاں تو ان کی طرف توجہ کرنا اور ان پر پیش آنے والے ضمنی مسائل سے بحث کرنا کلام شاہانہ کے لیے ہرگز موزوں نہیں ہے۔"[2]

مولانا مودودی کا یہ کہنا ہے کہ اس قسم کے مسائل محض اجتہاد سے طے کیے جاسکتے ہیں۔ چنانچہ صحابہ کو یہ خبر نہ تھی کہ سورۂ نساء کی اس آیت میں مرد اور مرد کے ناجائز تعلق کا حکم موجود ہے۔[3]

ہمارے پیش نظر مولانا محمود الحسن دیوبندی کا ترجمہ قرآن پاک ہے۔ انہوں نے سورۂ نساء کی آیت ۱۶ کا ترجمہ ہی یہ کیا ہے:

"اور جو دو مرد کریں تم میں سے وہی بدکاری تو ان کو ایذا دو۔"[4]

۱؎ ملتقط جامع التاویل ص ۴۵ ۲؎ تفہیم القرآن ج ۱ ص ۳۳۲ ۳؎ ایضاً ۴؎ ترجمہ شیخ الہند ص ۱۰۲۔

مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس آیت کی تشریح میں یہ وضاحت کی ہے کہ:

"اس آیت کو بہت سے علماء نے زنا پر حمل کیا ہے اور بعض نے لواطت پر اور بعض نے دونوں کو شامل رکھا ہے۔"

سبیل کا مفہوم سورۂ نساء کی آیت ۱۵ میں سبیل مقرر کرنے کا جو ذکر ہے وہ قابلِ غور ہے۔ علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں:

السبیل الذی جعلہ اللہ ھو الناسخ لذلک .... وھو امر متفق علیہ [1]	سبیل وہی ہے جس نے اس حکم کو منسوخ کیا ہے یعنی رجم و جلد اور یہ متفقہ مسلک ہے۔

مگر ابو مسلم نے اس متفقہ مسلک کے برخلاف اپنی رائے یہ دی ہے کہ:

وامانحن فانا نفسر ذلک بان یسھل اللہ لھا قضاء الشھوۃ بطریق النکاح [2]	سبیل پیدا کرنے کا مطلب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ ان عورتوں کو اس وقت تک مقید رکھا جائے تا آنکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نکاح کے ذریعہ ان کی شہوت پوری کرنے کا نظم نہ ہوجائے۔

چنانچہ ابو مسلم کی اس تاویل کی صورت میں آیت زیر بحث پر ان کا پہلا اشکال بھی زائل ہوجاتا ہے اور آیت کے مفہوم میں ایک منطقی ربط پیدا ہوتا ہے۔

واقعہ سامری سورۂ طٰہٰ میں حضرت موسیٰؑ اور سامری کا مکالمہ مذکور ہے ارشاد باری ہے:

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۴۶۳ [2] ملتقط جامع التاویل ص ۳۵۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ (طٰہٰ-۹۵-۹۶)	کہا موسیٰ نے اب تیری کیا حقیقت ہے اے سامری۔ بولا میں نے دیکھ لیا جو اوروں نے نہ دیکھا، پھر بھر لی میں نے ایک مٹھی پاؤں کے نیچے سے اس بھیجے ہوئے کے، پھر میں نے وہی ڈال دی اور یہی صلاح دی مجھ کو میرے جی نے۔

مفسرین کا متفقہ قول ہے کہ الرسول سے مراد حضرت جبرئیلؑ ہیں جن کے گھوڑے کے سم کے نیچے کی خاک سامری نے کسی موقع پر اٹھالی تھی چنانچہ اس نے اسی خاک کو گوسالہ کے پیٹ میں ڈال دیا جس کی تاثیر سے اس میں جان آگئی اور وہ بولنے لگا مگر ابو مسلم کے نزدیک الرسول سے مراد حضرت موسیٰ ہیں، وہ واقعہ کی نفی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لیس فی القرآن تصریح بھذا الذی ذکرہ المفسرون [1]	مفسرین نے جو یہ واقعہ بیان کیا ہے اس کی تصریح قرآن مجید میں موجود نہیں ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ عربوں کا محاورہ ہے الرجل یقفوا اثر فلان ویقبض اثرہ یعنی فلاں شخص فلاں کے نقشِ قدم پر چلتا ہے اور اس کی پیروی کرتا ہے۔ یہی مفہوم اس آیت میں بھی ہے۔ ان کے خیال میں آیت کا مطلب یہ ہے۔

"حضرت موسیٰؑ نے جب سامری کو لعنت ملامت کی اور اس سے پوچھا کہ کیوں تم نے لوگوں کو گمراہی کا راستہ دکھایا تو وہ ڈھٹائی کے ساتھ جواب میں کہنے لگا کہ مجھ کو اس

---

[1] ملتقط جامع التاویل ص ۶۹۔

چیز کا علم ہوگیا جو اوروں کو نہ ہوا۔ یعنی مجھ کو یہ انکشاف ہوا کہ آپ کا مذہب برحق نہیں ہے، حالانکہ پہلے میں کچھ دنوں آپ کی اتباع کرچکا تھا، مگر اب میں نے آپ کے دین کو چھوڑ دیا ہے۔[1]

ابومسلم کی اس تاویل کو گو امام رازی نے جمہور مفسرین کے برخلاف بتایا ہے مگر یہ کہہ کر اس کی تحسین بھی کی ہے کہ:

ولکنہ اقرب الی التحقیق[2]	جمہور کی مخالفت کے باوجود یہ تفسیر تحقیق سے زیادہ قریب ہے۔

امام رازی نے ابومسلم کی تائید میں بعض دلائل بھی دیے ہیں، مثلاً:

۱۔ عموماً حضرت جبریلؑ کے لیے لفظ رسول مستعمل نہیں ہوتا اور سلسلۂ کلام میں بھی کہیں ان کا ذکر نہیں آیا ہے اس لیے ان کو مراد لیے جانے کا کوئی قرینہ نہیں۔

۲۔ عام تفسیر میں حضرت جبریلؑ کے گھوڑے کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے قرآن پر اضافہ لازم آتا ہے جس کا آیت میں کوئی ذکر نہیں ہے۔

۳۔ بنی اسرائیل کے اتنے آدمیوں میں حضرت جبریلؑ کیوں صرف سامری ہی کو دکھائی دیے، وہ اوروں کو کیوں نہیں نظر آئے۔

بعض مفسرین یہ کہتے ہیں کہ سامری کو بچپن میں حضرت جبریلؑ نے پالا تھا اس لیے وہ ان سے متعارف تھا۔ امام رازی نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر یہ درست ہے، تو اس کو بنی اسرائیل کے دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں حضرت موسیٰؑ کا زیادہ متبع ہونا چاہیے تھا۔[3]

۱؎ ملتقط جامع التاویل ص ۶۶، ۷۰۔ ۲؎ تفسیر کبیر ج ۶ ص ۱۰۱ ۳؎ ایضاً۔

علامہ آلوسی نے جمہور کے مسلک کی حمایت میں امام رازی کے اشکالات کا جواب دیا ہے اور ابومسلم کی تفسیر پر بنیادی اعتراض یہ کیا ہے کہ یہ تفسیر ماثور کے خلاف ہے۔ گو انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی مرفوع روایت ثابت نہیں ہے تاہم ان کا کہنا ہے کہ خیر القرون کے یہ اقوال مرفوع ہی کا حکم رکھتے ہیں:

علامہ آلوسی نے دوسرا اہم اعتراض یہ کیا ہے کہ اس تفسیر سے بے ربطی پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ حضرت موسیٰؑ وہاں موجود تھے، بلکہ آیت میں حاضر کے بجائے غائب کا اسلوب استعمال کرنا لازم آتا ہے۔[1]

ابومسلم نے آیت میں حاضر کے لیے غائب کا اسلوب استعمال کرنے کی توجیہ یوں کی ہے:

انما اورد بلفظ الاخبار عن غائب کما یقول الرجل لرئیسہ وھو مواجہ لہ مایقول الامیر فی کذا و بماذا یأمر الامیر[2]	اس موقع پر مخاطب کے بجائے غائب کا اسلوب ایسے ہی استعمال ہوا ہے، جیسے کہ آدمی اپنے آقا کو خاطب کرکے کہتا ہے کہ اس معاملہ میں امیر کیا فرماتے ہیں یا یہ کہ ان کا کیا حکم ہے۔

ہندوستانی مفسرین میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جمہور مفسرین اور ابومسلم اصفہانی دونوں ہی کی تفسیر پر سخت تنقید کی ہے۔ ان کے بقول اس آیت کی تفسیر میں دونوں طرف سے کھینچ تان کی گئی ہے۔[3] مولانا نے ابومسلم کی تاویل کو معموں اور پہیلیوں سے تعبیر کیا ہے اور جمہور کی تفسیر پر یہ کہہ کر اعتراض کیا ہے کہ:

"قرآن یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ فی الواقع ایسا ہوا تھا، وہ تو صرف یہ بتا رہا ہے کہ حضرت

۱؎ روح المعانی ج ۱۶ ص ۲۳۰۔ ۲؎ ملتقط جامع التاویل ص ۷۰۔ ۳؎ تفہیم القرآن ج ۳ ص ۱۱۹۔

موسیٰ کی باز پرس کے جواب میں سامری نے یہ بات بنائی، پھر ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ مفسرین اس کو ایک امر واقعی اور قرآن کی بیان کردہ حقیقت کیسے سمجھ بیٹھے"[۱]

مولانا مودودی نے الرسول سے حضرت جبریلؑ یا حضرت موسیٰؑ دونوں میں سے کسی کو بھی مراد لینے کو مستبعد نہیں قرار دیا ہے۔ ان کے بقول یہ ایک پُرفریب داستان تھی جس کو سامری نے گھڑا تھا اور اس کے لیے حضرت جبریلؑ یا حضرت موسیٰؑ کسی کے بھی نقشِ قدم کی مٹی کا کرشمہ سمجھا جائے نفسِ واقعہ پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا[۲]

مولانا صدرالدین اصلاحی کی مرتب کردہ تلخیص تفہیم القرآن میں یہ وضاحت موجود ہے کہ مولانا کے نزدیک الرسول سے حضرت موسیٰؑ ہی مراد ہیں، اس میں یہ لکھا ہے کہ:

"رسول سے مراد ممکن ہے کہ جبریلؑ ہی ہوں جیسا کہ قدیم مفسرین نے سمجھا ہے لیکن غالباً مراد حضرت موسیٰؑ ہیں"[۳]

غرض مولانا مودودی کی تاویل کے مطابق بھی اسلوب کی مخالفت کا اشکال بجنسہ باقی رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے ابومسلم ہی کے معمہ کا سہارا لینا پڑے گا، چنانچہ مولانا آزاد نے اسی کی تاویل کو اختیار کیا ہے[۴]

ربط آیات کا اہتمام ابومسلم اصفہانی کے طریقۂ تفسیر کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ نظم آیات کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں، چنانچہ انہوں نے اسی کی مناسبت سے بعض آیتوں کی تفسیر بالکل انوکھی کی ہے، طوالت کے خوف سے اس قسم کی صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

لفظ شفیع کا مفہوم سورۂ یونس کے آغاز میں آسمان و زمین کی تخلیق اور اللہ تعالیٰ کے مدبر

[۱] تفہیم القرآن ج ۳ ص ۱۱۹ [۲] ایضاً ص ۱۲۰ [۳] تلخیص تفہیم القرآن ص ۵۰۶ [۴] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۴۳۴، ۴۳۵ مطبوعہ ساہتیہ اکادمی۔

کائنات ہونے کا مضمون بیان ہوا ہے اور ان دلائل کا ذکر کرکے اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد باری ہے:

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ	تحقیق تمہارا رب اللہ ہے جس نے بنائے
السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ	آسمان اور زمین چھ دن میں پھر قائم ہوا
أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ	عرش پر تدبیر کرتا ہے کام کی، کوئی
يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مَا مِن شَفِيعٍ إِلَّا	سفارش نہیں کر سکتا مگر اس کی اجازت
مِن بَعْدِ إِذْنِهِ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ	کے بعد، وہ اللہ ہے رب تمہارا سو اس کی
رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ	بندگی کرو کیا تم دھیان نہیں کرتے۔

(یونس: ۳)

امام رازی نے اس آیت کی تفسیر میں ایک اہم سوال یہ اٹھایا ہے کہ آیت کے مضمون میں ابتدائے خلق کا ذکر ہے اور اسی میں شفاعت کا بھی مضمون ہے جس کو از روئے ترتیب احوالِ قیامت کے ضمن میں ہونا چاہیے[۱]، گو امام رازی نے اس کے جواب میں متعدد وجوہ بیان کیے ہیں مگر ان سے ان کے قائم کردہ سوال کا تشفی بخش جواب نہیں ملتا، اسی ضمن میں انہوں نے ابومسلم کی یہ منفرد تاویل بھی نقل کی ہے جو مضمون کے تسلسل کو قائم رکھتی ہے وہ کہتے ہیں:

الشفیع ھنا ھو الثانی وھو	لفظ شفیع اس موقع پر ثانی کے معنی
ماخوذ من الشفع الذی یخالف	میں ہے اور یہ شفع سے ماخوذ ہے جو
الوتر کما یقال الزوج والفرد	وتر کا مخالف ہے جیسے زوج اور فرد

[۱] تفسیر کبیر ج ۴ ص ۳۴۸۔

فمعنی الآیۃ خالق السموات	بولتے ہیں، چنانچہ آیت کا مفہوم یہ ہے
والارض وحدہ ولا حی معہ	کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کی تخلیق
ولا شریک بعینہ ثم خلق	اس حال میں کی ا س وقت کسی اور
الملائکۃ والجن والبشر	کا وجود نہ تھا۔ پھر ملائکہ، جن اور بشر
وھو المراد من قولہ الآمن	پیدا کیے اور اس کا مفہوم من بعد
بعد اذنہ ای لم یحدث احد	اذنہ سے نکلتا ہے، مطلب یہ ہے کہ
ولم یدخل فی الوجود الا من	کسی کو بھی وجود حاصل نہیں ہوا مگر
بعد ان قال لہ کن حتی کان	بعد اس کے کہ اللہ نے کہا کہ ہو جاؤ
وحصل [1]	تو وہ ہو گیا۔

خاتمہ طوالت کے خوف سے اس مضمون میں ابو مسلم اصفہانی کے تفسیری اقوال کا مختصر جائزہ ہی پیش کیا جا سکا ہے، اگر اس کے تمام اقوال کا احاطہ کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔ تاہم اس مختصر جائزہ سے بھی یہ بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ علم تفسیر میں وہ بلند پایہ تھا، اسی لیے بیشتر معقولی تفسیروں میں اس کے اقوال کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔

عام مفسرین اس کے افکار کو قبول تو کر لیتے ہیں مگر اس کے نام کی صراحت نہیں کرتے، غالباً اس کا سبب ہوگا کہ اس کے بارہ میں یہ عام شہرت ہو گئی ہے کہ وہ معتزلی تھا، مگر ہم نے مضمون کے آغاز میں صراحت کر دی ہے کہ اعتزال سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا، محض معتزلہ کے بعض خیالات کی تائید کی بنا پر اس سے اور اس کی تفسیر سے بیزاری انصاف و تحقیق کے منافی ہے۔

---

[1] ملتقط جامع التاویل ص ۶۱۔

سائنس میں مسلمانوں کا عروج و زوال

از۔ مولانا شہاب الدین ندوی

(۲)

خلافت ارض اور علم الاشیاء الغرض مسلم معاشرہ کی اس پس ماندگی کا بنیادی اور سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اہلِ اسلام نے مجموعی اعتبار سے اس علم کو بھلا دیا جس پر قرآنی نقطۂ نظر سے "خلافت ارض" کا دار و مدار ہے۔ یعنی "علم الاشیا" یا قرآن کی اصطلاح میں "علم الاسماء" جس میں رسوخ حاصل کیے بغیر دین و شریعت کو استحکام حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ علم دین و شریعت کے لیے ایک محافظ (باڈی گارڈ) کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ علم انسان اول (حضرت آدم علیہ السلام) کو نہ صرف آپ کی تخلیق کے فوراً بعد عطا کر دیا گیا بلکہ اس کی تدریس علم شریعت پر بھی مقدم رکھی گئی اور پھر مزید یہ کہ اس علم سے مشرف ہونے کی بدولت آپ کو فرشتوں پر فضیلت بھی دے دی گئی۔ یہ علم کیا تھا سوائے اشیائے عالم کے "ناموں" کے؟

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا۔	اور اس نے آدمؑ کو تمام چیزوں کے
(بقرہ: ۳۱)	نام بتا دیے۔

مفسرین نے تحریر کیا ہے کہ تمام چیزوں اور ان کے ناموں سے مراد کل مخلوقات و موجودات کے نام انکے خواص و تاثیرات اور دینی و دنیوی حیثیت سے ان کے منافع کا

علم ہے[1] اور یہی وہ چیزیں اور ان کے خواص و تاثیرات (فزیکل پراپرٹیز) ہیں جو جدید سائنسی علوم کا موضوع بحث ہیں۔ بالفاظِ دیگر جدید سائنسی علوم جن چیزوں سے بحث کرتے ہیں ان کا تعلق یا تو جمادات و سماوات سے ہے یا پھر حیوانات و نباتات سے۔ لہٰذا سائنسی علوم کا دائرہ مخلوقاتِ الٰہی سے باہر نہیں ہے۔

اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان اول کو اس علم کی تعلیم کس لیے دی اور اس کی غرض و غایت کیا ہے؟ تو اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر خلیفہ بنا کر پیدا کیا گیا تھا اس لیے ضروری تھا کہ جو ہستی زمین پر خلیفہ بن کر آنے والی ہو وہ پہلے زمینی اشیاء سے صحیح صحیح تعارف حاصل کر لے۔ تاکہ موجودات عالم سے ناواقفیت کے باعث وہ کسی مشکل یا خطرے میں نہ پڑ جائے۔ اسی لیے باری تعالیٰ نے خلیفہ اول کو نظریاتی اعتبار سے تمام چیزوں کے "نام" اور ان کے "کام" پہلے ہی سے بتا دیے تاکہ وہ ان اشیاء کا صحیح استعمال بھی کر سکے۔ چنانچہ اس واقعہ میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جو قوم اشیائے عالم اور ان کے خواص و تاثیرات (فزیکل پراپرٹیز) کو یاد رکھے گی وہ زمین پر بحیثیت خلیفہ برقرار رہے گی اور اس کی دھاک دیگر قوموں پر قائم ہو جائے گی جس طرح کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اس علم سے مشرف ہونے کے لیے فرشتوں پر فضیلت عطا کی گئی تھی۔ بالفاظِ دیگر جو قوم اس علم سے تہی مایہ ہو وہ اس علم میں برتر قوموں کی دست نگر بن کر رہ جائے گی۔[2] چنانچہ آج یہ صورت حال واضح طور پر ہمارے

---

[1] خلاصہ از تفسیر ابن جریر: ۱/۷۰، تفسیر ابن کثیر: ۱/۳، تفسیر کشاف: ۱/۲۷۲، تفسیر کبیر: ۲/۱۹۳، احکام القرآن جصاص رازی: ۱/۳۱، تفسیر المنار: ۱/۲۶۲ [2] یہ بحث راقم السطور کی کتاب "اسلام کی نشاۃ ثانیہ قرآن کی نظر میں" کا خلاصہ ہے جو مجلس نشریات اسلامی کراچی سے شایع ہو چکی ہے۔

سامنے موجود ہے اور اس کے لیے مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

آج مسلم معاشرہ میں جو فکری انتشار اور مسلم نوجوانوں میں جو مایوسی کے جذبات پائے جاتے ہیں وہ اس علم کو فراموش کر دینے ہی کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئے ہیں اور یہ وہ علم ہے جو ہمارے دین و دنیا دونوں کی بھلائی کا ضامن تھا اور ہے۔ لہٰذا اہلِ اسلام جب تک اس علم سے چھوت چھات برتتے رہیں گے، ان کی مایوسی اور بے چارگی کا یہی عالم رہے گا کیونکہ یہ علم فکری، شرعی، تمدنی، اجتماعی، سیاسی اور بین الاقوامی ہر لحاظ سے انتہائی اہم اور قوموں کی کامیاب زندگی کا ضامن ہے۔ لہٰذا جو قوم اس علم سے عاری ہو جائے وہ زمین پر خلیفہ کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔

اس لحاظ سے امت مسلمہ اور خاص کر نوجوان طبقہ کو دوبارہ دنیا کے اسٹیج پر لانے کے لیے ضروری ہے کہ مسلم معاشروں میں "علم الاشیاء" یا "علم الاسماء" کا پھر سے چرچا کیا جائے۔ یعنی "علم آدم" سے دوبارہ اپنا رشتہ استوار کیا جائے، تاکہ ہماری کھوئی ہوئی شان و شوکت اور عظمت رفتہ دوبارہ حاصل ہو سکے۔

بعض تاریخی حقائق | یہ قرآنِ عظیم کی مثبت رہنمائی ہی کا نتیجہ تھا کہ قرون وسطیٰ میں امتِ مسلمہ نے سائنس کے میدان میں زبردست کامیابیاں حاصل کیں اور علمی دنیا کو علوم و فنون اور جدید سائنس کا تحفہ دیا۔ جدید سائنس کی ابتدا قرون وسطیٰ میں اہلِ اسلام ہی کی تحقیقات سے ہوتی ہے۔ چنانچہ آٹھویں صدی سے لے کر تیرہویں صدی عیسوی تک اس میدان میں ان کا کوئی مدمقابل نہیں تھا۔ بلکہ اس دور میں یورپ جہالت کی تاریکیوں سے گزر رہا تھا۔ پھر مسلمانوں کی علمی ترقیوں کی بدولت مغربی قوموں میں بھی رفتہ رفتہ بیداری آئی اور وہ بھی علوم و فنون اور تسخیرِ کائنات کے میدان میں آگے بڑھنے لگیں۔ چنانچہ چودہویں صدی سے

سولہویں صدی عیسوی کے عرصے میں یورپ میں علمی احیاء کا عمل ظاہر ہوا، جو اس کا "دورِ احیاء" (RENAISSANCE) کہلاتا ہے۔ پھر اس کے بعد جس رفتار سے یورپ علمی و فنی میدان میں ترقی کرتا گیا اسی رفتار سے عالم اسلام اس میدان میں پیچھے ہوتا گیا کیونکہ اس دوران مسلم حکومتیں سیاسی و عسکری میدان میں پسپا ہو چکی تھیں اور اس سلسلے میں زوال اسپین (۱۴۹۲ء) سلطنت اسلامیہ کے زوال کی آخری کڑی تھی۔ اس حادثۂ فاجعہ کے بعد عالم اسلام پر پوری طرح جمود طاری ہو گیا اور یہ ایک دلخراش تاریخی حقیقت ہے۔

امت مسلمہ کا سنہرا دور بہرحال امت مسلمہ نے قرآنی دعوتِ فکر سے سیراب ہو کر جدید سائنسی علوم کی جو بنیاد ڈالی اور تجربات و مشاہدات کے ذریعہ جو علمی کارنامے انجام دیے وہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ خاص کر بغداد، سسلی اور قرطبہ وغیرہ میں سائنسی تجربہ گاہیں رصد گاہیں اور علمی مراکز قائم کر کے طبیعی اور حیاتیاتی علوم کو خوب ترقی دی اور ریاضیات ہندسہ، فلکیات، طب، نباتیات، کیمیا اور طبیعیات وغیرہ میں تجربات کر کے ہزاروں کتابیں تصنیف کیں۔ قدیم یونانی سائنس کو تجربے و مشاہدے کی کسوٹی پر پرکھ کر کھرے اور کھوٹے کو الگ کیا، جو محض نظریات و مفروضات پر مبنی تھی اور اس سلسلے میں وہ بنیادی طور پر قرآنی فکر اور اس کی ثقافت سے متاثر تھے جو ہر چیز کو تجرباتی و مشاہداتی نظر سے دیکھنے پر زور دیتا ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر بعض قرآنی آیات پچھلے صفحات میں گزر چکی ہیں۔

اس لحاظ سے امت مسلمہ نے قرآنی دعوت کے مطابق ایک نئے طرزِ فکر کی بنیاد ڈالی اور عالم انسانی کو تجرباتی علوم کا تحفہ دیا اور یہ نیا علم دین و شریعت کے سائے میں پھلنے پھولنے لگا، جس کی وجہ سے مسلم معاشرے میں اس علم سے کبھی تنفر پیدا نہیں ہوا، بخلاف خالص فلسفیانہ مسائل کے جو اکثر و بیشتر دین و شریعت سے متعارض تھے، فقہاء و محدثین کو

"علم کلام" سے جو چڑھ تھی وہ صرف فلسفیانہ مسائل کی وجہ سے تھی نہ کہ نظامِ فطرت سے متعلق تجرباتی و مشاہداتی حقائق سے۔ کیونکہ نظامِ فطرت سے متعلق انکشافات تو عین قرآنی دعوتِ فکر کے مطابق ہوتے ہیں، جن سے اصولِ دین کا اثبات مقصود ہے۔

فطرت و شریعت میں تعارض نہیں ہے اوپر گزر چکا ہے کہ علمائے متقدمین اور خاص کر امام غزالی، امام رازی اور امام ابن تیمیہ نے فطرت و شریعت میں مطابقت ثابت کر کے اہلِ اسلام کی صحیح رہنمائی کی ہے اور اس باب میں خصوصیت کے ساتھ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ کے فتاویٰ اور ان کی دیگر تحریریں بصیرت افروز ہیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں ایک قیمتی اور زریں اصول یہ بیان کیا ہے کہ عقل صحیح اور نقل صحیح میں کبھی تعرض نہیں ہو سکتا۔ یعنی عقل و تجربے کی رو سے ایسی کوئی حقیقت ثابت نہیں کی جا سکتی جو دین و شریعت سے متصادم ہو، سوائے ان چیزوں کے جن میں کسی قسم کا اشتباہ یا اضطراب موجود ہو۔

النصوص الثابتة فی الکتاب والسنة لا یعارضها معقول بین قط، ولا یعارضها الا ما فیه اشتباه واضطراب۔[1]

اس اعتبار سے فطرت و شریعت میں تطبیق کا عمل ہر دور میں جاری رہنا چاہیے تاکہ دین الٰہی کی برتری ہمیشہ ظاہر ہوتی رہے اور مسلم معاشرہ کبھی احساس کمتری میں مبتلا ہونے نہ پائے۔ مگر عصر جدید میں قدیم طرزِ فکر کے علماء نے اپنی کوتاہ فہمی کی بنا پر جب قرآن اور جدید علوم میں تطبیق کی مخالفت کرتے ہوئے اسلام کو جدید علوم و مسائل سے

---

[1] موافقة صحیح المنقول لصریح المعقول، از ابن تیمیہ: ۱/۱۲۶، دار الکتب العلمیة، بیروت، ۱۹۸۵ء، نیز ملاحظہ ہو، فتاویٰ ابن تیمیہ: ۶/۵۵۷، مطبوعہ دار الافتاء ریاض۔

لا تعلق قرار دے دیا تو اس کے منفی اثرات مسلم معاشروں پر پڑے، جن کی وجہ سے فکری انتشار اور ایک نئی قسم کی تشکیک نے جنم لیا۔ لہٰذا اس منفی طرز عمل کو ترک کر کے مثبت طرز عمل اپنانے کی ضرورت ہے۔

محققین کے اعترافات اہل اسلام نے اپنے سنہرے ادوار میں تحقیقات و تجربات کے ذریعہ جو علمی کارنامے انجام دیے ہیں، ان کا اعتراف بہت سے مغربی و مشرقی مفکرین اور اہل قلم نے کھلے ذہن کے ساتھ کیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں تاریخ عرب کا مصنف فلپ کے حتی لکھتا ہے:

"آٹھویں اور تیرہویں صدی کے درمیان عربی بولنے والے ہی پوری دنیا میں تہذیب و تمدن کے مشعل بردار رہے ہیں۔ مزید براں وہی قدیم سائنس اور فلسفے کی بازیافت کا واسطہ بھی بنے۔ پھر ان علوم میں اضافہ کر کے انہیں اس طور پر منتقل کیا کہ (انہی کے باعث) مغربی یورپ کی نشاۃ ثانیہ ممکن ہو سکی۔ اس پورے عمل میں عربی اسپین (اندلس) کا بہت نمایاں حصہ ہے"[1]

یہی مصنف ایک دوسری جگہ تحریر کرتا ہے: "عرب فضلاء نے صرف چند دہوں میں وہ سب کچھ حاصل کر لیا جس کو فروغ دینے میں یونانیوں نے صدیاں لگا دی تھیں"[2]

سائنسی میدان میں مسلمانوں کے تفوق اور برتری کا اعتراف انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں اس طرح کیا گیا ہے:

"تقریباً ایک ہزار سال کے دوران سائنس یورپ میں خوابیدہ حالت میں رہی اور

۱؎ ہسٹری آف دی عربس، از فلپ کے حتی، ص ۵۵۷، دسواں ایڈیشن، مطبوعہ لندن، ۱۹۷۰ء

۲؎ ایضاً ص ۳۰۷۔

عربوں نے جنھوں نے نویں صدی عیسوی میں اپنا دائرۂ عمل اسپین تک بڑھا لیا تھا سائنس کے محافظ و نگراں رہے اور انہوں نے دیگر علوم و فنون کی طرح حیاتیاتی علوم میں بھی فوقیت اور غلبہ حاصل کر لیا"[1]

مشہور عرب فاضل جرجی زیدان نے فن طب میں اہل اسلام کے کارناموں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ:

"مسلمانوں نے یونانیوں، فارسیوں، اہل ہند اور کلدانیوں کی طب کو جمع کر کے اس میں بہت زیادہ اضافہ کیا، جیسا کہ ان کی طبی کتابوں کی مراجعت سے ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ بطور مثال وہ اکثر و بیشتر جالینوس یا بقراط کی رائے بیان کرنے کے بعد اس پر تنقید کرتے ہوئے اس کی غلطی واضح کرتے اور صحیح بات بیان کرتے ہیں اور جن کتابوں کا انہوں نے ترجمہ کیا اور ان کی ترتیب و تبویب میں جو جدت دکھائی وہ اس کے علاوہ ہے۔ نیز اسی طرح انہوں نے قدماء کی کتابوں کی شرحیں اور ان کے ضمیمے تحریر کرنے کا فن بھی ایجاد کیا۔ چنانچہ ابن جلجل نے "دیقوریدس" کی کتاب کے ضمیمے میں ایسے عقاقیر کا تذکرہ کیا ہے جنھیں قدماء نہیں جانتے تھے"[2]

مصری عالم احمد امین مسلمانوں کے نئے نئے اکتشافات کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ:

"عربوں نے حساب، الجبرا، ہندسہ، فلکیات اور میکانکس وغیرہ میں مہارت حاصل کی۔ انہوں نے اہل یونان اور اہل ہند کے علوم سے استفادہ کیا۔ چنانچہ ان کی زندگی کے خاص تجربے نے ایسے اکتشافات کی طرف ان کی رہنمائی کی جو یونانیوں کے نزدیک

۱؎ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا: ۲/۱۰۱۸، ایڈیشن ۱۹۸۳ء ۲؎ تاریخ التمدن الاسلامی، از جرجی زیدان: ۲/۲۰۲، بیروت۔

معروف نہیں تھے اور اس سلسلے میں اکثر انصاف پسند مستشرقین نے ان کے بہت سی ایجادات کا اعتراف کیا ہے جن سے یونانی اور ہندی ناواقف تھے"۔[1]

مشہور مغربی مفکر محمد اسد (سابق لیوپولڈ ویس) عربوں کے کارناموں اور ان کی عبقریت پر روشنی ڈالتے ہوئے صاف تحریر کرتے ہیں:

"عربوں نے قدیم یونانی علوم کے احیاء کے سلسلے میں جو کچھ کیا وہ بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے پوری جدت کے ساتھ اپنے لیے ایک نئی علمی دنیا پیدا کی اور بحث کے نئے نئے طریقے ایجاد کیے اور انہیں بہتر بنایا پھر انہوں نے اس پورے عمل کو مختلف واسطوں سے مغرب تک پہنچایا۔ لہٰذا جب ہم یہ کہیں تو کوئی مبالغہ نہیں ہو سکتا کہ وہ نیا علمی دور جس میں آج ہم سانس لے رہے ہیں، اس کا افتتاح نصرانی یورپ کے شہروں میں نہیں، بلکہ دمشق، بغداد، قاہرہ اور قرطبہ جیسے اسلامی مرکزوں میں ہوا ہے"۔[2]

سائنس اور معاشرہ اس بحث سے بخوبی واضح ہو گیا کہ جدید تجرباتی علوم کی داغ بیل ڈالنے اور انہیں ترقی دینے والے عرب مسلمان تھے اور مسلمانوں کو اس راہ پر ڈالنے والا اسلام کا صحیفہ قرآن عظیم ہے۔ یہ حقیقت بھی واضح رہے کہ سائنسی علوم کی ترقی کی بدولت کسی بھی معاشرے پر ان کے اثرات پڑنا لازمی رہتا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی معاشرہ سائنسی علوم کے اثرات سے آزاد نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا اس موقع پر ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام جدید سائنسی علوم کی ترقی کے نتیجے میں کون سے فوائد حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے کیا اغراض و مقاصد ہیں؛ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے بہت سے اغراض و مقاصد ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:

---

[1] ظہر الاسلام احمد امین ۲/۱۹۸، پانچواں ایڈیشن، بیروت ۱۹۶۹ء [2] الاسلام علی مفترق الطرق (اسلام ایٹ دی کراس روڈ کا عربی ترجمہ)، ص ۴۳، بیروت آٹھواں ایڈیشن، ۱۹۷۴ء۔

۱۔ اس عمل کے ذریعہ انسانی معاشروں میں سائنسی طرزِ فکر اور سائنسی مزاج پیدا ہو سکے، جس کے باعث مظاہر پرستی اور تاریک خیالی کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔

۲۔ نظامِ کائنات میں پنہاں اللہ کی نشانیاں (دلائل ربوبیت) منظر عام پر آجائیں جس کے نتیجے میں اسلامی عقائد و تعلیمات کی صداقت ظاہر ہوتی ہے۔

۳۔ غلط افکار اور مادہ پرستانہ فلسفوں کا ابطال ہو جائے، جس کے باعث منکرین حق پر خدا کی حجت پوری ہوتی ہے۔

۴۔ خلافتِ ارض کے مقاصد پورے ہوں۔ یعنی سائنسی علوم کی ترقی سے ایک طرف خدا کی نعمتیں ظاہر ہوں تو دوسری طرف مسلم معاشرہ طاقتور ہو، تاکہ وہ فوجی اور سیاسی میدان میں آگے بڑھ سکے اور وہ مادی قوتوں سے لیس ہو کر جہاد کے ذریعہ دنیا سے ظلم و عدوان کو ختم کر کے عدل و انصاف قائم کر سکے۔

۵۔ فطرت و شریعت میں مطابقت کے باعث مسلم معاشرہ متوازن رہے اور اسکے نتیجے میں اہلِ اسلام اور خاص کر نوجوان طبقے کے فکر و نظر کا تزکیہ بھی ہوتا رہے جو دین و شریعت پر ثابت قدمی کا باعث ہوگا۔

۶۔ روحانیت اور مادیت کے ملاپ سے ایک خدا پرستانہ تہذیب وجود میں آئے جو ایک مثالی اور آئیڈیل تہذیب اور افراط و تفریط سے پاک ہو۔

نیز اس کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

ارتداد کی ایک نئی لہر اسلامی ممالک میں اگر یہ عمل قرونِ وسطیٰ سے لے کر موجودہ دور تک تسلسل کے ساتھ جاری رہتا تو معاشرہ سائنسی علوم کے ثمرات و حاصلات سے ضرور متمتع

ہوتا اور وہ تمام مقاصد بھی ضرور پورے ہوتے جو اوپر مذکور ہو چکے ہیں اور اس عمل کے نتیجے میں وہ فکری انتشار ہرگز پیدا نہ ہوتا جو آج دین و دنیا کی تفریق کے باعث پایا جا رہا ہے، چنانچہ مغربی ممالک کی اس میدان میں متاثر کرنے والی اور خیرہ کن ترقی کے باعث غیر ترقی یافتہ قومیں ان سے مرعوب ہو کر احساسِ کمتری میں مبتلا ہو چکی ہیں اور ترقی یافتہ قوموں کی ظاہری چمک دمک سے ان کی آنکھیں چکا چوند ہو چکی ہیں۔ لہٰذا وہ ان کے افکار و نظریات اور ان کے فلسفوں سے متاثر ہو کر ان کی تقلید کرنا اور ان کی تہذیب اختیار کرنا اپنے لیے باعثِ فخر تصور کرتی ہیں۔

غرض آج پوری دنیا مغرب کی ساحری سے متاثر ہو کر اسے اپنا امام تسلیم کر چکی ہے اور اس کی تقلید کرنا اپنے لیے عزت و وقار کا باعث سمجھتی ہے اور اس باب میں خود مسلمانوں کا وہ طبقہ اور خاص کر ان کے نوجوان جدید علوم سے آراستہ ہو کر اسلامی ماحول اور اسلامی افکار و اقدار سے دور ہو چکے ہیں اور مغربی تہذیب و تمدن کو اپنانے اور خود کو اس کے رنگ میں رنگ لینے ہی میں اپنی کامیابی اور نجات تصور کرتے ہیں اور ایسے لوگ مادی فلسفوں جیسے تشکیک، لاادریت، عقلیت، لادینیت، افادیت، لذتیت، اباحیت اور نظریۂ ارتقا وغیرہ پر یقین کرتے ہوئے دینی عقائد و افکار کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ اگرچہ مسلم گھرانوں اور مسلم ماحول میں بھی رہتے ہوں تب بھی ان کے اذہان پوری طرح "مغربی" نظر آتے ہیں اور ان کی چال چلن اور سوچنے سمجھنے کا انداز بھی پوری طرح مغربی بن کر رہ گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی ایک قسم کا ارتداد ہی ہے جسے ہم ذہنی ارتداد" کہہ سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے آج جدید مادہ پرستانہ فلسفے پوری نوع انسانی کو "لوریاں" دے دے کر میٹھی نیند سلا رہے ہیں اور اخروی اعتبار سے

اس کی "موت کا سامان فراہم کر رہے ہیں۔

دجالی تہذیب اور اس کا کھوکھلا پن

مغربی ممالک کی موجودہ تہذیب روحانیت سے عاری ایک بے خدا تہذیب ہے جو یونان کی مادہ پرستانہ تہذیب کا نیا روپ ہے اور وہ محض مادیت کے سہارے اور ظاہری طور پر روشن اور چمکیلی نظر آتی ہے مگر اندر سے بالکل کھوکھلی اور گھناؤنی بن چکی ہے، یہ خود غرضی، عیاشی، عیاری و مکاری، دہشت گردی، جنگ بازی، قتل و غارت گری اور انسان کشی پر یقین و ایمان رکھتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ موجودہ مغربی معاشرہ خدا اور آخرت کو یکسر فراموش کر کے مادیات کی وادی میں کھو گیا ہے اور بقول محمد اسد اس کی عبادت گاہیں بڑے بڑے کارخانے، سینما گھر، کیمیائی تجربہ گاہیں، رقص و سرود کے مراکز اور بجلی کے پاور ہاؤس ہیں اور اس کے پیشوا بنک کار، انجینئر، فلم ڈائرکٹر، صنعت و حرفت کے قائدین اور ہوا باز ہیں۔[1]

غرض آج مغربی قومیں دنیوی عیش و عشرت میں مست و مگن ہو کر بدمستی اور خرمستی کے نئے نئے ذرائع اور نئے نئے وسائل کی تلاش و جستجو میں منہمک ہیں اور سوائے بطن و فرج کی آسودگی کے اور کوئی اعلیٰ و ارفع مقصد ان کے پیشِ نظر نہیں ہے، گویا کہ یہ دو روزہ دنیوی عیش و آرام ہی ان کی جنت ہے۔ ع

بابر بہ عیش کوش کہ ایں عالم دوبارہ نیست

دجالی فتنہ اور اس کی بعض علامتیں

یہ وہ نارِ فرنگ ہے جس میں آج سارا عالم جل رہا ہے اور کشاں کشاں موت کی وادی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ بعض احادیث میں یہ جو کہا گیا ہے کہ دجال کی جنت حقیقتاً دوزخ اور اس کی دوزخ حقیقتاً جنت ہوگی تو بات آج

---

[1] الاسلام علی مفترق الطرق، محمد اسد، مترجم ڈاکٹر عمر فروخ، ص ۴۴-۴۸۔

مغربی ممالک کی دجالی پر پوری طرح صادق آتی ہے اور اس کے علاوہ دجال کی بہت سی علامتیں بھی موجودہ مغربی تہذیب پر منطبق ہوتی ہیں۔ چنانچہ دجال کی ایک واضح علامت اس کا کفر بھی ہے، جسے آج ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے، اسی طرح دجال کی ایک اور علامت یہ بھی بتائی گئی ہے کہ وہ کانا یعنی ایک آنکھ کا ہوگا جو انگور کے دانے کی طرح ابھری ہوئی اور بے نور ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دجالی تہذیب ہر چیز کو ایک آنکھ سے دیکھتی ہے اور دوسری آنکھ ہمیشہ بند رکھتی ہے۔ خاص کر دینی و روحانی حقائق کو جھٹلانے کے سلسلے میں اپنی "علمیت" بلکہ "علامیت" کا رعب جماتے ہوئے انتہائی عیاری و مکاری کے ساتھ ان کا انکار کرتی ہے اور لوگ اس کے جھانسے میں آکر دینی و اخلاقی اقدار کو مجذوب کی ایک بڑ قرار دے کر ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ احادیث میں دجال کو اگرچہ ایک شخص یا ایک فرد قرار دیا گیا ہے، جو غالباً بطور تمثیل ہے، لیکن اس کی بہت سی علامتیں موجودہ مغربی تہذیب اور اس کی ٹکنالوجی پر صادق آتی ہیں، واللہ اعلم۔

ذیل میں اس سلسلے کی چند احادیث ملاحظہ ہوں:-

۱- کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے اپنی قوم کو دجال سے ڈرایا نہ ہو۔ لیکن میں تم سے اس کے بارے میں ایک ایسی بات بتاتا ہوں جسے کسی نبی نے بھی اپنی قوم کو نہیں بتایا۔ وہ کانا ہوگا، جب کہ اللہ کانا نہیں ہے[1]۔

۲- دجال کی آنکھوں کے درمیان ک ف ر یعنی کفر لکھا ہوا ہوگا[2]۔

[1] بخاری کتاب الفتن: ۱۰۲/۸، مطبوعہ استانبول، ۱۹۸۱ء [2] مسلم کتاب الفتن: ۲۲۴۸/۴ مطبوعہ ریاض، ۱۹۸۰ء۔

۳- مسیح دجال داہنی آنکھ کا کانا ہوگا، گویا کہ اس کی آنکھ انگور کے دانے کی طرح ابھری ہوئی (یا بے نور) ہوگی[1]۔

۴- دجال داہنی آنکھ کا کانا اور گھنے بالوں والا ہوگا۔ اس کے ساتھ جنت اور دوزخ ہوگی۔ مگر اس کی دوزخ (حقیقتاً) جنت اور اس کی جنت (حقیقتاً) دوزخ ہوگی[2]۔

۵- دجال کے ہمراہ پانی اور آگ دونوں چیزیں ہوں گی۔ مگر اس کی آگ (درحقیقت) ٹھنڈا پانی ہے اور اس کا پانی آگ ہے۔ لہذا تم ہلاک نہ ہو جاؤ[3]۔

وقت کا سب سے بڑا جہاد

یہ ہے وہ دجالی فتنہ جس کی مہیب اور ہیبت ناک شکل و صورت جو واقعتاً عالم اسلام کے سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں پیچھے ہو جانے کی وجہ سے آج ابھر کر سامنے آگئی ہے یہ فتنہ پورے عالم انسانی کو ہڑپ کرنے کے لیے ایک خوفناک اژدھے کی طرح پھنکارتے ہوئے اپنے جبڑے پھاڑے پوری طرح تیار کھڑا ہے۔ لہذا اگر امت مسلمہ بیدار ہو کر وقت کے اس سب سے بڑے فتنے کے استیصال کے لیے کمر بستہ نہ ہوئی تو پھر دجالی تہذیب کا سیل رواں عالم اسلام سمیت پورے عالم انسانی کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جائے گا۔

اس فتنے کے استیصال کے لیے دو محاذوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ پہلا محاذ علمی و استدلالی ہے اور دوسرا سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں عالم اسلام کی پیش قدمی ہے۔ مگر ان دونوں میدانوں میں کام کرنے کے لیے امت مسلمہ کو سائنسی علوم میں پوری طرح رسوخ حاصل کرنا ضروری ہے۔ ورنہ الحاد و مادیت کا جادو ٹوٹ نہیں سکتا کیونکہ موجودہ "سائنس زدہ" اور "فلسفہ زدہ" تو ہیں سوائے "سائنسی زبان" کے کسی دوسری

[1] مسلم کتاب الفتن ۲۲۴۷/۴ [2] صحیح مسلم: ۲۲۴۹/۴ [3] بخاری: ۱۰۳/۸، مسلم: ۲۲۴۹/۴۔

زبان میں بات کرنے کے لیے تیار دکھائی نہیں دیتیں۔ لہٰذا "کَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰی قَدرِ عُقُولِہِم" (لوگوں سے ان کی سمجھ کے مطابق گفتگو کرو) کے اصول کے مطابق عصر جدید کے انسان پر خود اس کی زبان اور منطق کے مطابق علمی و استدلالی میدان میں شکست دیکر خدا کی حجت خدا کی ابدی سنت کے مطابق پوری کرنا وقت کی سب سے بڑی ضرورت اور سب سے بڑا جہاد ہے۔ اسی بنا پر باری تعالیٰ نے اپنی کتاب حکمت کو ہر قسم کے علمی و عقلی دلائل سے لیس کر دیا ہے، تاکہ وہ ہر دور کے تقاضے کے مطابق اپنا رہبرانہ کردار ادا کرتے ہوئے نوع انسانی کی ہدایت کا باعث بن سکے۔ لہٰذا اب یہ فریضہ اہل اسلام پر عائد ہوتا ہے کہ وہ اس سلسلے کے تمام مسائل کا جائزہ لے کر پوری بیدار مغزی کے ساتھ عصر جدید کے اس سب سے بڑے چیلنج سے نپٹنے کے لیے ایک حکمت عملی تیار کریں۔

نشاۃ ثانیہ کے لیے سخت جدو جہد ضروری حاصل بحث یہ کہ آج ملت اسلامیہ کے دکھوں کا مداوا جہاد اور صرف جہاد ہے اور ہمارے تمام مسائل و مشکلات کا حل جہاد اور اس کی تیاری میں پوشیدہ ہے۔ یعنی علمی جہاد، استدلالی جہاد، سائنسی جہاد، صنعتی جہاد اور پھر تہذیبی و تمدنی جہاد۔ غرض آج امت کو ہر میدان میں جہاد کرنے اور جہادی اسپرٹ کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ ہر میدان میں ترقی کر کے جدید علوم و فنون اور جدید تہذیب و تمدن میں جو کھوٹ اور جو شر و فساد سرایت کر گیا ہے اسے دور کر سکے اور ہر میدان میں کانٹے کا مقابلہ کر کے دجالی تہذیب کو شکست فاش دے سکے۔ آج امت مسلمہ کے پاس کیا نہیں ہے؟ اگر وہ چاہے تو ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کر کے دین الٰہی کا علم اونچا کر سکتی ہے اور اس کے نتیجے میں اسلامی معاشرہ ہی کی نہیں بلکہ پورے عالم انسانی کی فکری و نظریاتی اور تہذیبی و تمدنی ہر حیثیت سے اصلاح ہو سکتی ہے اور

لوگ چین و سکون کا سانس لے سکتے ہیں۔

اس جہادی عمل اور جہادی اسپرٹ کے بغیر امت کی نشاۃ ثانیہ عمل میں نہیں آسکتی کیونکہ احیائے دین و ملت کا یہ عمل سخت محنت اور جدو جہد کا طالب ہے اور اس راہ میں اگر اپنے تمام وسائل کو جھونکنے کی ضرورت بھی پڑ جائے تب بھی اس میں دریغ نہ کرنا چاہیے ورنہ احیائے دین و ملت مجرد آرزوؤں کے سہارے برپا نہیں ہو سکتا۔

خلافت ارض کا فلسفہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر خلیفہ بنا کر پیدا کیا ہے اور کار خلافت کے لیے "علم اسماء" کا تحفہ بھی عنایت کر دیا ہے۔ لہٰذا جو قوم یا جو ملت علم اسماء میں رسوخ حاصل کیے بغیر خلیفہ بننا چاہے گی وہ اپنے مقصد میں ناکام رہے گی۔ یہ وہ خدائی سبق ہے جسے اس نے انسان اول کو یہ علم عطا کر کے جتا دیا تھا اور بطور اشارہ اس کی اہمیت واضح کر دی تھی۔

خلافت ارض کے دو حصے ہیں: ایک روحانی اور دوسرا مادی اور خلافت کی تکمیل کے لیے ان دونوں میں ملاپ ضروری ہے ورنہ جو قوم روحانیت کے بغیر صرف مادی خلافت پر قابض ہو جائے وہ شیطان بن کر شیطانی ناچ ناچ سکتی ہے جیسا کہ آج مغرب کا حال ہے اور جو قوم صرف روحانی خلافت پر قابض ہو کر مادی خلافت سے عاری ہو جائے، وہ "شیطانوں" کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لہٰذا شیطانوں کو قابو میں رکھنے اور روحانیت کو غالب کرنے کے لیے خود کو مادی قوتوں سے بھی لیس کرنا ضروری ہے۔

الغرض آج خلافت کا مادی حصہ اہل مغرب کے پاس ہے اور اس کا صرف روحانی حصہ اہل اسلام کے پاس ہے۔ ان دونوں کو جب تک پھر سے ملایا نہیں جاتا خلافت ارض کی تکمیل نہیں ہو سکتی اور خلافت ارض کی تکمیل ہی کا دوسرا نام اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہے۔ اس لیے

آج پورے عالم اسلام کو ایک یونٹ بن کر خلافتِ ارض کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل ہونا چاہیے۔ یہی اسلام کا اصل مقصد اور اس کی مطلوبہ منزل ہے اور یہی اسلام کا فلسفہ تمدن واجتماع ہے۔ اسی غرض وغایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان اول حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو علم اسماء سے نوازتے ہوئے ان کے سر پر خلافتِ ارض کا تاج رکھا تھا۔ پس اہلِ اسلام کو اپنی کھوئی ہوئی شان وشوکت کی بازیافت کے لیے اس علم سے دوبارہ اپنا ناطہ جوڑنا پڑے گا۔ ورنہ خلافت کے میدان میں ہمیشہ ذلیل وخوار اور ترقی یافتہ قوموں کے باج گزار بن کر رہ جائیں گے۔

دینِ الٰہی کا غلبہ واستیلاء واضح رہے مغرب سے جو چیز لینی ہے وہ صرف تجرباتی علوم اور صنعت وحرفت یا ٹکنالوجی ہے، نہ کہ اس کے نظریات وفلسفے۔ دراصل اس کے تجرباتی علوم بھی اسلامی علوم ہی ہیں جن کو اہلِ اسلام نے قرونِ وسطیٰ میں فروغ دیا تھا اور یہ علوم اصلاً قرآنِ عظیم کی دعوتِ فکر کی بدولت منظر عام پر آسکے ہیں اور پھر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ تجرباتی علوم میں الحاد ولادینیت کا کوئی شائبہ تک نہیں ہے۔ بلکہ الحاد ولادینیت یا مادہ پرستانہ افکار ونظریات جس چیز کا نام ہے وہ دراصل تجرباتی علوم کی مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے تشریح وتوجیہ ہے۔ لہٰذا ہم کو صرف تجرباتی علوم ومسائل سے تعلق رکھتے ہوئے مادہ پرستانہ افکار ونظریات کو رد کر دینا چاہیے۔ اور یہ کام ہم خود تجرباتی علوم کی روشنی میں انجام دے سکتے ہیں۔ آج چونکہ ان علوم پر مادہ پرستوں کا قبضہ ہے اس لیے وہ ان علوم کی من مانی تشریح کرتے ہیں۔ جب کہ انکی روحانی نقطۂ نظر سے بھی تشریح وتوجیہ کرکے مادیت کا بخوبی رد کیا جا سکتا ہے۔ یہی قرآنِ عظیم کا اصل منشاء ومقصد ہے اور اسی غرض سے اسلام نے تجرباتی علوم کی ترقی پر زور

دیا تھا، تاکہ نظامِ کائنات میں جو خدائی دلائل وبراہین "آیات بینات" کے روپ میں پنہاں ہیں وہ کھل کر سامنے آجائیں اور دوسری طرف مظاہر کائنات کی تسخیر سے ان میں موجود خدائی نعمتیں بھی ظاہر ہو جائیں جو صنعت وٹکنالوجی میں ترقی کا باعث ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے آج زمین پوری طرح تیار ہو چکی ہے۔ لہٰذا اب اہلِ اسلام کو اس میدان میں کود کر ایک طرف علمی اعتبار سے دلیل واستدلال کا بازار گرم کرنا چاہیے جس کے نتیجے میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا تو دوسری طرف تمدن وصنعت کے میدان میں آگے بڑھ کر خلافت ارض کے مادی وروحانی دونوں حصوں کو پھر سے یکجا کرنا بھی آسان ہو جائے گا۔ اس طرح دلیل وحجت اور قوت وطاقت دونوں اعتبار سے دینِ الٰہی کا غلبہ واستیلاء مطلوب ہے اور ان دونوں میدانوں میں جب تک پیش رفت نہیں ہوتی یہ مقصدِ عظیم ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا۔

دار المصنفین کی نئی کتابیں

۱۔ شذراتِ سلیمانی: حصہ دوم، مولانا سید سلیمان ندوی کے شذراتِ معارف کی تروتازگی اور معنویت اب بھی باقی ہے اسی لیے دار المصنفین نے انکو شایع کرنے کا پروگرام بنایا ہے، چند برس پہلے اسکا پہلا حصہ شایع ہوا تھا، اب اس دوسرے حصہ میں ۲۵ء سے ۳۲ء تک کے شذرات جمع کیے گئے ہیں، آخر میں ایک مفصل اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔ قیمت ۱۵۰ روپے

تذکرۃ الفقہاء: جلد اول، از عمیر الصدیق دریابادی۔ اس کتاب میں فقہائے شافعیہ کی خدمات کا مفصل احاطہ کیا گیا ہے، پہلی جلد میں امام مزنی سے امام ابواسحٰق اسفرائنی تک کل ۲۶ نامور فقہاء کا تذکرہ آگیا ہے۔

قیمت ۹۵ روپے۔

امریکا کے بعض میوزیم کے چند قیمتی مخطوطات

از

پروفیسر نذیر احمد۔ علی گڑھ

راقم الحروف نے ادھر چند سالوں میں امریکا کا کئی بار سفر کیا اور وہاں کے مختلف شہروں میں مقیم رہا، اپنے قیام کے دوران وہاں کے بعض عجائب خانوں کے قیمتی مخطوطات کا بھی مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ وہاں کے قیام اور عجائب خانوں کے مطالعے سے بعض اہم نتائج برآمد ہوئے۔

۱۔ ہندوستان کی سیاسی اور تہذیبی تاریخ کے متعلق امریکی عجائب خانوں میں اتنا قیمتی مواد موجود ہے کہ اس سے استفادے کے بغیر ہمارے بعض نتائج قابلِ اعتبار نہیں ٹھہرتے۔

۲۔ عجائب خانوں میں جو مواد موجود ہے اس کا بیشتر حصہ فارسی میں ہے، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فارسی زبان کی اہمیت صرف ملکی سطح پر نہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی ہے۔

۳۔ عجائب خانوں میں فارسی کے ایسے مخطوطے ملتے ہیں جو فنون لطیفہ کی تاریخ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں، مصوری، شبیہ کشی، خطاطی وغیرہ کی ترقی میں ان مخطوطوں کا اہم رول رہا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ MINIATURE PAINTING میں اتنا وافر مواد یہاں موجود ہے کہ اس سے فنونِ لطیفہ کی اس شاخ کی ایک دلچسپ تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔

۴۔ فارسی میں MINIATURE پینٹنگ کے جتنے دلچسپ مخطوطے موجود ہیں کسی اور زبان میں نہ ہوں گے۔

۵۔ ان مخطوطات کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی ادب کا جو شعبہ مصوری اور شبیہ کشی سے تعلق رکھتا، یہاں کے میوزیم میں اس سے متعلق مواد فراہم کیے گئے ہیں۔

۶۔ امریکا کے عجائب خانوں کے مخطوطات کا جتنا مطالعہ ہونا چاہیے نہیں ہوسکا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح کے افراد اس سلسلے میں درکار ہیں وہ نہیں ملتے، اس میں شبہ نہیں کہ دنیا کی سیکڑوں یونیورسٹیوں میں فارسی کی تعلیم ہوتی ہے، لیکن ان کا طریقہ تعلیم اور نصاب تعلیم ایسا ہے کہ یہ درسگاہیں ایسے افراد کی تربیت سے ناکام رہتی ہیں جو ملکی اور عالمی ضرورت کی کفالت کرسکیں۔ ایسے افراد کی ضرورت ہے جن سے تاریخی، تہذیبی ضرورت پوری ہوسکے، دراصل ہم اس طرف صحیح طرح متوجہ نہ ہوسکے، جس کی وجہ سے ایسی زبان جو صدیوں کی تاریخ و تہذیب کی اجارہ دار رہی ہے، اب کس مپرسی کی حالت میں پڑگئی ہے۔

ان ابتدائی امور کے ذکر کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، جس موضوع پر ہم گفتگو کرنے جا رہے ہیں وہ بہت وسیع ہے، اتنا وسیع کہ ایک نشست میں اس کے مبادیات کا احاطہ ممکن نہ ہوگا۔ فی الحال ہماری گفتگو امریکا کے چند عجائب خانوں کے چند مخطوطات تک محدود رہے گی۔

واشنگٹن ڈی۔ سی میں ایک مشہور میوزیم FRCER GALLERY OF ART ہے، اس میں مشرقی زبانوں کے کافی مخطوطات ہیں، خصوصاً ہندوستان کی تاریخ و تہذیب سے متعلق فارسی مخطوطات ہیں، مخطوطات کے علاوہ اور دوسری یادگاریں ہیں، انہیں میں جہانگیر کے زمانے کا ایک چاقو ہے، یہ تاریخی چاقو ہے جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

توزک جہانگیری میں ۱۶ویں سال جلوس کے ذیل میں جہانگیر رقم طراز ہے: اس زمانے کے عجیب و غریب واقعات میں ایک واقعہ یہ ہے کہ ۳۰ خرور دین ۱۰۳۰ھ مطابق ۲۰ اپریل ۱۶۲۱ء کو پرگنہ جالندھر کے ایک گاؤں میں ایسا مہیب ہنگامہ برپا ہوا کہ قریب تھا کہ وہاں کے لوگوں کا دم گھٹ جائے، اس شور و ہنگامے کے دوران آسمان سے ایک روشنی زمین پر اتری نظر آئی، اس سے لوگوں کو گمان ہوا کہ آسمان سے آگ کی بارش ہونے والی ہے، جب تھوڑی دیر کے بعد شور و شغب میں کمی ہوئی تو عامل پرگنہ محمد سعید کے پاس تیز رو قاصد کے ذریعے اس سانحے کی خبر پہنچائی گئی، وہ فوراً جائے وقوع پر پہونچا، دیکھا کہ دس بارہ گز زمین جھلس کے راکھ ہوگئی ہے، اس کے حکم سے زمین کھودی جانے لگی، زمین کھودی جاتی اور اندر حرارت و تپش بڑھتی جاتی، اندر جاکر لوہے کا ایک تپتا ہوا ٹکڑا ملا، اتنا گرم کہ معلوم ہوتا تھا بھٹی سے ابھی نکلا، جب وہ ٹھنڈا ہوا تو عامل پرگنہ نے اسے تھیلے میں سربمہر میرے دربار میں بھیج دیا، میں نے اس کا وزن کرایا تو ایک سو ساٹھ تولے نکلا، میں نے استاد داؤد کو حکم دیا کہ اس سے دو تلواریں، ایک خنجر اور ایک چاقو بنا کر میری خدمت میں پیش کرے، یہ برقی لوہا ہتھوڑے کی چوٹ نہیں کھاتا اور پھسل جاتا تھا، میں نے کہا اس صورت میں دوسرا لوہا ملا کر یہ چیزیں بنائی جائیں چنانچہ اس نے تین حصہ برقی لوہے میں ایک حصہ عام لوہا ملا کر دو تلواریں، ایک خنجر، اور ایک چاقو تیار کیا اور جہانگیر کی خدمت میں یہ چیزیں پیش کیں، عام لوہے کی آمیزش سے برقی لوہا جوہر دار ہوگیا، اس سے بنی ہوئی تلواریں شمشیر یمانی اور شمشیر جنوبی اصیل کی طرح خم ہو جاتی تھیں اور خم ہونے کا کوئی نشان ان پر نہیں پڑتا، چنانچہ آزمائش پر ان کی کاٹ اچھی نکلی، میں نے ان میں سے ایک کا نام شمشیر قاطع اور دوسری کا برق سرشت رکھا،

بے بدل خاں نے اس واقعے سے متعلق یہ رباعی کہہ کر پیش کی:

از شاہ جہانگیر جہان یافت نظام	افتادہ بہ عہد او ز برق آہن خام
از آن آہن شد بحکم عالمگیرش	یک خنجر و کارد با دو شمشیر تمام

شعلہ برق بادشاہی مادۂ تاریخ قرار پایا (توزک)

آسمان سے گرے ہوئے لوہے سے بنا ہوا چاقو FRCER GIALLERY میں محفوظ ہے، جس کے دستے اور پھل پر یہ قطعہ درج ہے:

فتادہ بعہد جہانگیر شاہ	ز برق آہن برق وش جوہری
جہانگیر اکبر بہ فرمود از ان	دو شمشیر و این کارد و خنجری

اس کے بعد سنہ ۳۰ اور سنہ ۱۶ درج ہے، سنہ ۳۰ سے سال ۱۰۳۰ھ اور سنہ ۱۶ سے سولھواں سال جلوس مراد ہے۔

اسی میوزیم میں عبدالرحیم خان خاناں کے حکم سے رامائن کا جو فارسی ترجمہ تیار ہوا تھا وہ موجود ہے، اس ترجمے کے آخر میں خان خاناں کے قلم سے یہ تاریخی عبارت درج ہے:

این کتاب کہ موسوم است بہ رامائن	یہ کتاب جس کو رامائن کہتے ہیں ہندوستان
کہ از کتب معتبر ہند است (دارای)	کی معتبر کتابوں میں سے ہے، یہ کتاب
واحوال رام چند کہ از بادشاہان	رام چندر کے احوال پر مشتمل ہے جن کا شمار
بزرگ ہند بودہ و خوبیہای صوری	ہندوستان کے بڑے بادشاہوں میں
و معنوی او بمرتبہ بودہ کہ مظہر صفات	ہوتا ہے اور جن کی ظاہری باطنی صفات
الہی شدہ بود بالتماس بالمیک کہ	اس مرتبے کی ہیں کہ وہ صفات الٰہی کے

از درویشان بزرگ ہند بودہ او را
پسر جادو می گویند تفاصیل احوال
او از صفات جسم و اخلاق پسندیدہ
و فتوحات عظیم و دیانت
افعال او کہ دال باشد بر عظمت حال
او بیان می نماید، بحکم بندگان حضرت
عرش آشیانی نقیب خان از سادات
جلیل القدر قزوین بودہ بمصاحبت
و خدمت این شاہنشاہ بلند مسند
سربلند گشتہ مشرف و سرافراز
گشتہ حسب الحکم از زبان سنسکرت
کہ علوم ہندیہ بہ آن زبان تدوین
یافتہ ترجمۂ فارسی نمود، دیبی مصر
نام برہمنی بود کہ او معنی اشلوک می
گفت و نقیب خان فارسی ترجمہ
میکرد، حسب الحکم آن بادشاہ جم
جاہ درین مواضع کہ این کتاب مصوّر
کہ تصویر کردند، بعد از اتمام آن
این بندہ پروردہ مرحمت الخیری

منظر ہو گئے تھے، بالیک جو ہندوستان
کے بڑے درویشوں میں تھے، ان کو
پسر جادو کہتے ہیں، انھوں نے ان کے
تفصیلی حالات، ان کی جسمانی خوبیاں
ان کے پسندیدہ اخلاق، ان کی بڑی بڑی
فتوحات اور ان کے اچھے اعمال کو جو
ان کی بزرگی پر دلالت کرتے ہیں بیان
کر دیے ہیں، حضرت عرش آشیانی
(شہنشاہ اکبر) کے حکم سے نقیب خاں
جو قزوین کے جلیل القدر سادات میں
تھا اور جو اس شاہنشاہ کی مصاحبت
و خدمت میں مشرف و سرفراز ہوا تھا
سنسکرت زبان سے جس میں ہندی
علوم کی کتابیں تدوین ہوئی تھیں،
فارسی میں ترجمہ کیا، دیبی دین مصر
نام کا ایک برہمن تھا جو اشلوک کے
معنی بیان کرتا اور نقیب خاں فارسی
ترجمہ کرتا، بادشاہ جم جاہ کے حکم سے
اس کتاب میں جہاں جہاں تصویر کی

عبدالرحیم ابن محمد بیرم عفی اللہ
عنہما التماس نمود کہ چون توجہ اشرف
باین کتاب می بینم نقلی بردارم از
روی عنایت اجازہ دادند و کاتبان
و مصوران این نیک اندیش جہانیان
تصویر و ترقیم نمودند و باین طریق
کہ در نظر یاران حاضر است در
سال ہزار و ہفت باتمام رسید
و ابتدا و تصویر و ترقیم در نہصد
و نود و شش شدہ بود، مجموع مجالس
یکصد و سی و پنج مجلس و اوراق سیصد
و چہل و نہ ورق اتمام در ایام اہتمام
مخلص مصاحب مولا شکیبی امامی
رحمۃ اللہ باتمام رسید۔

ضرورت تھی تصویریں بنا دی گئیں،
اس کے اتمام کے بعد یہ بندہ جو بادشاہ
کی مرحمت کا پروردہ تھا یعنی عبدالرحیم
ابن محمد بیرم (عفی اللہ عنہما) بادشاہ
کی خدمت میں عرض پرداز ہوا کہ چونکہ
حضرت عالی کی توجہ اس کتاب کی طرف
بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے، میری
خواہش ہے کہ اس کی نقل تیار کرائی
جائے، از روی عنایت اجازت دیدی
تو اس دنیا کی بھلائی چاہنے والے
خیر خواہ جہانیان کے کاتبوں اور
مصوروں نے اس کی کتابت اور
تصویر کشی کر ڈالی اور اس طرح یہ لوگوں
کے سامنے آئی، ۱۰۰۷ھ میں یہ کتاب
مکمل ہوئی، اس کی کتابت اور تصویر کشی
کا کام ۹۹۶ھ میں شروع ہوا، مجموعی
تصویریں ۱۳۵ ہیں اور کل اوراق ۳۴۹
ہیں، اس کتاب کا اتمام مخلص مولانا شکیبی
امامی رحمہ اللہ کے زیر اہتمام ہوا۔

اس ترقیمہ کے سلسلے کی چند اہم باتوں کی طرف اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ عبدالرحیم نے یہ ترقیمہ ۱۰۰۷ھ کے کافی بعد تحریر کیا ہے۔

۲۔ یہ ترقیمہ عجلت سے لکھا گیا اور نظر ثانی سے محروم رہا۔ اس کی بنا پر اس میں چند غلطیاں باقی رہ گئیں، کہیں الفاظ چھوٹ گئے، کہیں الفاظ دوبارہ لکھ گئے، کہیں عبارت گنجلک ہو گئی، خان خاناں جیسے فاضل اور صاحبِ فن کی اس مختصر سی عبارت میں اتنی خامیوں کا راہ پانا حیرت خیز ہے، اگر یہ عبارت کسی اور کاتب کی ہوتی تو اس کے سر منڈھ جاتی لیکن کاتب خود خان خاناں ہے تو یہ غلطیاں کس کے سر منڈھیں جائیں۔

۳۔ بقول ڈاکٹر میلوبیچ مولف کتاب IMPERIAL IMAGE اس نسخہ میں ۱۳۰ مجالس تصاویر اور ضخامت ۶۹۲ صفحات کی ہے، حالانکہ ترقیمے میں مجالس تصاویر کی تعداد ۱۳۵ اور ضخامت ۶۴۹ صفحات کی بتائی گئی ہے، قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ترقیمے کے انگریزی ترجمے میں جو نقص سے پاک نہیں صرف ۱۲۵ مجالس تصاویر بتائی گئی ہیں، لیکن ترجمہ میلوبیچ کا نہیں B.N. GOSWAMY کا ہے۔

رامائن کا یہ نسخہ FRCER GALLERY آف آرٹ کے بہترین نسخوں میں ہے، اور اس پر وہاں والوں کو بجا طور پر ناز ہے۔ لیکن اہلِ ہند کو اپنے اس سرمایے کی کوئی خبر نہیں، آنکھوں کو خیرہ کرنے والے یہ خزانے حکیم الامت شاعرِ مشرق کو اپنے جذبات ایک فکر انگیز نظم کے پیش کرنے پر مجبور کرتے ہیں جس کے یہ اشعار تو سبھی کے حافظے میں محفوظ ہوں گے۔

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی — نہیں فطرت کے آئین مسلّم سے کوئی چارا

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی — جو ان کو دیکھئے یورپ میں دل ہوتا ہے سیپارا

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن — کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

FRCER GALLERY کے چند اور نوادر مخطوطات کا مختصر سا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ انتخاب دیوان رومی، نظامی، سعدی، سنائی (مخطوطات 48.44) یہ جہانگیر اور شاہجہاں کے کتابخانے میں رہ چکا ہے، جہانگیر کی دو یادداشتیں اور شاہجہاں کی ایک یادداشت سے مزین ہے، ایک یادداشت یہ ہے:

اللہ اکبر

پنجم آذر سنہ ۱ داخل کتابخانۂ این نیازمند درگاہ الٰہی شد،

حررہ نورالدین جہانگیر شاہ ابن اکبر بادشاہ

دوسری یادداشت:

اللہ اکبر

این مجموعہ کہ منتخب چہار کتاب است از کتابہای خاصۂ منت، قیمت سہ ہزار روپیہ و بقلم خفی مشکل کہ بہتر ازین نوشتہ نشد،

شاہ جہاں کی یادداشت:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

این مجموعۂ نفیسہ کہ مشتمل است بر منتخب مثنوی و منتخب حدیقہ وغیرہ بتاریخ بیست و پنجم ماہ بہمن الٰہی موافق ہشتم جمادی الثانیہ سنہ ۱۰۳۷ ہجری کہ روز جلوس مبارک است داخل کتابخانۂ این نیازمند درگاہ شد، حررہ شہاب الدین محمد شاہ جہاں بادشاہ ابن جہانگیر بادشاہ ابن اکبر بادشاہ،

قیمت چہار ہزار روپیہ۔

کاتبان: شیخ محمود، میر علی حسینی، سلطان محمد نور، محمد قاسم بن شادی شاہ، سلطان محمد خندان

تحویل داران: خواجہ سہیل، خواجہ نعمت، محمد باقر، محمد اشرف۔

قیمت چہار ہزار روپیہ بقلم محمد اشرف۔

۲۔ انتخاب اشعار شعرا، بخط مولانا میر علی، سلطان محمد نور، سلطان محمد خندان و شمہ مصور بکار استاد بہزاد، از بابت میرزا عزیز کوکہ قیمت دو ہزار روپیہ، تحویل داران محمد باقر، محافظ خاں محمد صالح، محمد باقر، محمد مومن، محمد حافظ، چلپی بیگ۔

۳۔ ہفت منظر از ہاتفی مصور، مخطوطہ (56.14)

کاتب میر علی الکاتب برای سلطان عبدالعزیز بہادر

باہتمام سلطان میرک کتابدار۔

جہانگیر اور شاہ جہاں کے کتابخانوں کا نسخہ تھا، جہانگیر کی تحریر مٹا دی گئی ہے، شاہ جہاں کی یہ تحریر پڑھی جاتی ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الٰہی این ہفت منظر کہ از نوادر روزگار است و بخط میر علی الکاتب است بتاریخ بیست و پنجم ماہ بہمن موافق ہشتم جمادی الثانیہ سنہ ۲۷ کہ روز جلوس مبارک است داخل کتابخانۂ این نیازمند درگاہ شد، حررہ شہاب الدین محمد شاہ جہاں بادشاہ ابن جہانگیر بادشاہ ابن اکبر بادشاہ غازی، قیمت چہار ہزار روپیہ۔

دوسرا میوزیم "والٹرس آرٹ گیلری" بالٹی مور کا ہے، اس میں بھی بڑے قیمتی مخطوطات ہیں، اس میں امیر حسن دہلوی کا دیوان ہے جو میر عبداللہ مشکیں قلم کی خطاطی کا

بہترین نمونہ ہے، اس میں ۱۴ تصویریں ہیں، امیر حسن دہلوی، امیر خسرو کے معاصر اور شیخ نظام الاولیاء کے مرید تھے، انہوں نے اپنے شیخ کے ملفوظات فوائد الفواد نام سے مرتب کیے تھے دیوان اور ملفوظات دونوں طبع ہو چکے ہیں، لیکن دیوان کے ایسے قلمی نسخے بھی موجود ہیں جو خطاطی کے بہترین نمونے ہیں، ان میں سے ایک بالٹی مور میوزیم کا نسخہ ہے اور دوسرا خدا بخش پٹنہ کا ہے، یہ آخر الذکر نسخہ مشہور خطاط محمد حسین کشمیری کی کتابت کا ہے جس نے ۱۰۰۱ھ میں اس کی کتابت کی تھی، فی الحال بالٹی کے نسخے کا مختصر سا تعارف مقصود ہے۔

میر عبداللہ مشکیں قلم جہانگیر کے دور کے مشہور خطاط تھے، ان کی وفات ۱۰۳۵ھ میں ہوئی اور وہ آگرہ میں مدفون ہیں، ان کا چھوٹا سا مقبرہ آگرہ بائی پاس پر تلسی سنیما کے آگے جواہر بنگلہ میں ہنوز موجود ہے اور مقبرہ کی دیوار پر ان کے بیٹے صالح کشفی کا منظوم قطعۂ تاریخ درج ہے۔

اس مخطوطہ کی خصوصیت یہ ہے کہ دیوان الہ آباد میں اس وقت تیار ہوا جب سلطان سلیم اپنے باپ اکبر بادشاہ سے بدظن ہو کر خسرو باغ الہ آباد میں مقیم تھا اور وہیں سارے شاہی ٹھاٹ باٹ سے رہتا تھا، وہیں ایک نقاش خانہ تھا جہاں یہ نسخہ لکھا گیا اور شاہزادے سے متعلق مصوروں نے چودہ تصویروں سے مزین کیا، آخری صفحے پر عبداللہ مشکیں قلم کی تصویر ہے، کتابت کی تاریخ محرم ۱۰۱۱ھ ہے، اس کی تصویروں پر محققین نے مقالے لکھے ہیں، لیکن خود خطاط یعنی مشکیں قلم ان کے مطالعے کے موضوع نہ بن سکے، مایلو بیچ نے ان کے بیٹے میر صالح کشفی کو عمل صالح کے مصنف سے جو کشفی کے ہمنام تھے التباس کیا ہے، گویا وہ عبداللہ مشکیں قلم کے بارے میں کوئی واقفیت نہیں رکھتے

راقم نے اس مخطوطے کا مطالعہ کیا ہے اور اس پر ایک مقالہ بھی لکھا ہے جو ہنوز شایع نہیں ہو سکا ہے۔

تیسرا میوزیم کلیولینڈ کا ہے، اس میوزیم کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اس میں طوطی نامے کا مصور نسخہ ہے جو اکبری دور میں مرتب ہوا تھا، میوزیم میں طوطی نامے کے ۱۱۲ مجلس تصاویر ہیں، ، ورق کسی پرائیویٹ ذخیرے میں ہیں، ۶ ورق غائب ہیں، ڈاکٹر پرمود چند جنھوں نے طوطی نامہ شایع کیا، انھوں نے اکبری دور کے حسب ذیل مصوروں کے نام ڈھونڈھ نکالے ہیں، بنواری، بساون، دسونتھ، غلام علی، گجراتی، اقبال، لالو، سروان، سراجو، تارا، راقم حروف کلیولینڈ میوزیم میں دوبارہ گیا اور وہاں طوطی نامے کو دیکھا، اسی میوزیم میں مونس الاحرار جاجرمی کا ایک مصور ورق دیکھا، اس کی وجہ سے اس اہم کتاب کے بقیہ اوراق کا پتہ چل گیا جو کئی سال قبل مونس الاحرار کے مصور نسخے سے الگ کر کے بیچ لیے گئے تھے۔

چوتھا میوزیم فلاڈلفیا کا ہے، اس میوزیم کے مخطوطات تفصیل سے دیکھنے کا موقع نہ ملا، البتہ نصرتی کے حسن و عشق کے مصور نسخہ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، اس مثنوی کی ہم ادبیا فصل کی تصویر کشی ہوئی، تصویر میں راجا بکرم پریوں کا لباس اٹھا کر ایک جھاڑی میں چھپ گیا ہے اور پریاں اس سے لباس واپس کرنے کی درخواست کر رہی ہیں۔ یہ قیمتی مصور نسخہ مسز PHILIPS COLLINS نے اپنے شوہر کی یاد میں اس میوزیم کو عنایت کیا تھا۔ نصرتی علی عادل شاہ ثانی بیجاپوری (۱۶۶۵-۱۶۷۲) کے دربار کا ملک الشعرا تھا، مثنوی حسن و عشق اس کی مشہور تصنیف ہے، اس کا مصور نسخہ اس کتاب کی اہمیت کو دوبالا کرتا ہے، دکنی زبان کے محققین کے لیے اس مصور نسخے کے وجود کی اطلاع دلچسپی کا

موجب ہوگا۔

اسی میوزیم میں اکبر نامہ کا ایک مصور صفحہ دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ قراچہ خان باغی کا سر تھا، مصوروں میں بھورا اور مسکین کے نام ملتے ہیں۔ تصویر کے نیچے یہ عبارت ہے۔

حکم عالی شد کہ سر شوریدۂ آن حرام نمک را از دروازۂ آہنین کابل بیاویزند کہ موجب عبرت خود سران نفاق پیشہ گردد تصویر میں "عمل بھورہ چہرہ نامی مسکین" تحریر دیکھی جا سکتی ہے۔

پنسلوینیا یونیورسٹی میوزیم میں خمسۂ نظامی کا ایک مصور نسخہ ہے جس کے کاتب کا نام قاسم شیرازی ہے، جہانگیر اور شاہجہاں کے دور کا سب سے مشہور خطاط عبدالحق شیرازی تھا جس کو شاہجہاں نے امانت خاں کا لقب دیا تھا، عبدالحق شاہجہاں کے عہد کے نامور امیر افضل خاں شیرازی کا بھائی تھا۔ یہی امانت خاں تاج محل کے کتبات کا خطاط ہے، امانت خاں نسخ خط کا ماہر خطاط تھا، جہانگیر نے اسے سکندرہ میں اپنے باپ کے روضے کی عمارات کی کتبہ نویسی پر مامور کیا تھا، چنانچہ وہاں وہ اپنا نام عبدالحق لکھتا ہے بعد میں مدرسہ شاہی مسجد آگرہ میں اس کا نام عبدالحق امانت خاں ملتا ہے اور تاج محل میں صرف امانت خاں۔

امانت خاں کے باپ کا نام قاسم شیرازی تھا اور وہ بھی خطاط تھا، پروفیسر بیگلے کا خیال ہے کہ بخوبی ممکن ہے کہ پنسلوینیا میوزیم کا خمسۂ نظامی کا نسخہ امانت خاں کے باپ ہی کا کتابت کیا ہوا نسخہ ہو۔ میوزیم کے اس نسخے کی اہمیت اس کے کاتب کی وجہ سے ہے جو امانت خاں کے باپ کی قلم کی یادگار سمجھا جاتا ہے۔

نیویارک میں بنیاد کیورکیاں کے ایک نسخے کے ذکر کے بعد ہم اپنی گفتگو ختم

کر دے رہے ہیں، یہ نسخہ مونس الاحرار کا ہے، مونس الاحرار فارسی اشعار کا ایک اہم مجموعہ ہے، جس کا مرتب محمد بن بدر جاجرمی ہے جس نے ۷۴۱ھ میں یہ نسخہ تیار کیا تھا، کیورکیان کا نسخہ مولف کے اپنے خط میں ہے اور تاریخ کتابت ۷۴۱ھ ہے، یہ نسخہ مصور تھا، اس کا ۲۹ واں باب " فی ذکر اشعار مصور و اختیارات قمر" پر ہے، لیکن اشعار مصور کا جز موجودہ نسخہ میں نہیں پایا جاتا۔ میرزا قزوینی کو کیورکیان (M.HA OH-KEUOR KIAN) نے یہ نسخہ مطالعے کے لیے دیا تھا۔ کچھ دنوں بعد یہ نسخہ پھر میرزا قزوینی کے مطالعے میں آیا تو اس وقت یہ مصور جز غائب ہو چکا تھا۔

و نسخۂ اصلی دارای چند مجلس صورت بسیار ممتاز اعلی از جنس صور تہای دورۂ مغول بودہ است، ولی مغلاً، ہیچکدام از آنہا جز یکی کہ در پشت صفحۂ اول باقی نماندہ وچون قدری خراب و محو شدہ است دست بآن نزدہ اند وجود ندارد

مونس الاحرار اکثر راقم الحروف کے مطالعے میں رہی اور اس کے مصور اوراق کے گم ہو جانے سے میں باخبر تھا اور جب اتفاقاً میں نے اس کتاب کا مصور ورق کلیولینڈ میوزیم میں لٹکا ہوا دیکھا تو مجھے بقیہ مصور اوراق کے پتا لگانے کا خیال پیدا ہوا اور جب اس کی کوشش ہوئی تو کلیولینڈ میوزیم ہی کے واسطے سے اس کے بقیہ اوراق کی گمشدگی کا کامل یقین ہوا، یہ اوراق اصل کتاب سے الگ کر کے امریکا کے پانچ چھ میوزیم کے ہاتھ فروخت کر دیے گئے، کلیولینڈ کے علاوہ میٹروپالیٹن میوزیم نیویارک، فری ایر گیلری، بالٹی میوزیم وغیرہ میں چھ ورق موجود ہیں، راقم نے ان مصور اوراق کے حصول کے سلسلے میں فانلری میموریل والیوم میں ایک مقالہ لکھا ہے جو شایع ہو گیا ہو گا یا عنقریب شایع ہو گا، جس نظم کی تصویر کشی کی گئی ہے وہ مونس الاحرار

ج ۲ ص ۱۲۱-۷ پر استاد محمد الراوندی کی بتائی گئی، راقم حروف نے اس نظم کے ماخذ کا پتہ چلا لیا ہے، یہ پوری نظم محمد بن علی بن سلیمان الراوندی کی کتاب راحۃ الصدور میں درج ہے، راحۃ الصدور (ص ۴۵۸ - ۴۵۹) میں نظم اس طرح ہے:

پیش سلطان نند در فرمان بری　　آدمی و بحری و دیو و پری
شہ غیاث الدین کیخسرو کہ ہست　　تاج و تخت و رایت و انگشتری
مطرب و طباخ و نعل و کاتش　　زہرہ و خورشید و ماہ و مشتری
باد و خاک و آب و آتش بر درش　　خازن و صراف و پیک و جوہری

در پناہ عدل و باہم براز
شیر و گور و گرگ و میش و کبک و باز

در کف غلمان و احبابش بہم　　نیزہ و شمشیر و زوبین و قلم
باد فراشش آسمانش تا زند　　بارگاہ و خرگہ و کوس و علم
جملہ بریانی بخوانش بر مدام　　گاو و ماہی اشتر و اسب و غنم
بحر و کان کردہ نثار حضرتش　　لولو و یاقوت و دینار و درم

مطربان در بزمگاہ او بکف
بربط و چنگ و رباب و نای و دف

کردہ در بستان عیش او وطن　　گلبن و شمشاد و سرو و نارون
صید باز و صید یوز او شدہ　　کرگس و سیمرغ و پیل و کرگدن
مہر و ماہ و زہرہ و تیرش بنزم　　طبل باز و ساغر و تشت و لگن
بر تن بدخواہ او چیرہ شدہ　　خارپشت و لقلق و زاغ و زغن

رود باد در بوستانش ساختہ
بلبل[۷۵] و قمری[۷۶] و کبک[۷۷] و فاختہ[۷۸]

باد در باغ مرادش جلوہ گر	عندلیب[۷۹] و طوطی[۸۰] و طاوس[۸۱] نر
کردہ از نعل سمندش خسروان	گوشوار[۸۲] و یارہ[۸۳] و طوق[۸۴] و کمر[۸۵]
پارہ پارہ بر تن بدخواہ او	جوشن[۸۶] و خود[۸۷] و کج آگند[۸۸] و سپر[۸۹]
کارگر بر پیکر خصمان او	گرز[۹۰] و خشت[۹۱] و ناوخ[۹۲] و تیر[۹۳] و تبر[۹۴]

بار در صد ہزارش باغ دہ
سیب[۹۵] و نارنج[۹۶] و ترنج[۹۷] و نار[۹۸] و بہ[۹۹]

اس نظم کے سلسلے میں چند ضروری امور قابلِ توجہ ہیں۔

۱۔ اس میں کم از کم ۹۹ چیزیں ایسی ہیں جن کی تصویر کشی ہوئی ہے، شاید ہی کوئی مثال ملتی ہو جہاں سات ورق میں اتنی چیزوں کا عکس ملتا ہو، محمد جاجرمی نے مصوری کے لیے ایسی نظم کے انتخاب میں بڑی دانشمندی کا ثبوت دیا۔

۲۔ مونس الاحرار میں دوسرے بند کی: باد فراش الخ پہلے بند کی پانچویں بیت قرار دی گئی ہے اور اس اعتبار سے دوسرے بند میں (بشمول بیت بند) صرف چار بیت ملتی ہے، لیکن مونس الاحرار کے لائق مرتب کی نظر میں کاتب نسخہ کی یہ غلطی نہ آسکی۔

۳۔ یہ نظم تین بادشاہوں کی طرف منسوب ملتی ہے، راحۃ الصدور میں غیاث الدین کیخسرو، مونس الاحرار میں سلیمان شہ اور تذکرۂ شعرا دولت شاہ میں طغرل کے نام سے درج ہے، اس سلسلے میں تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے۔

راحۃ الصدور راوندی کی پہلی روایت غیاث الدین کیخسرو کے چھوٹے بھائی

سلیمان شہ کے نام سے تھی، سلیمان شہ نے ۵۹۰ھ میں اپنے بڑے بھائی کیخسرو سے حکومت چھین لی اور ۶۰۱ھ میں اس کی وفات ہوگئی تو پھر اس کا بڑا بھائی کیخسرو تخت نشین ہوا، راحۃ الصدور ۵۹۹ھ میں شروع ہوئی اور اس کا پہلا مسودہ سلیمان شہ کے عہد میں تیار ہوگیا تو راوندی نے اسے سلیمان شہ کے نام معنون کر دیا، لیکن جب اس کی وفات ہوگئی تو کتاب میں کچھ ترمیم کرکے غیاث الدین کیخسرو کے نام کر دی گئی، لیکن اس دوسری روایت میں ایسے امور اب بھی باقی رہ گئے ہیں جو اس کی پہلی DEDICATIN پر دلالت کرتے ہیں (دیکھیے مقدمہ کتاب بقلم ڈاکٹر محمد اقبال ص ۱۹-۲۰) اس لحاظ سے مونس الاحرار کی روایت درست ہے تذکرہ دولت شاہ (طبع لیڈن ص ۱۵۴-۱۵۵) میں دوسری بیت کا پہلا مصرع اس طرح ہے:

طغرل آن کز ہفت سلطان داد داو

گویا یہ نظم طغرل بن ارسلان سلجوقی (قتل ۵۹۰ھ) کی مدح میں ہے اور اس کا ناظم بقول دولت شاہ (طبع لیڈن ص ۱۵۴-۱۵۵) شرف الدین شفروہ ہے اگرچہ شفروہ ارسلان سلجوقی کا مداح تھا لیکن یہ راوندی کی معلوم ہوتی ہے علاوہ مونس الاحرار کی شہادت کے خود راحۃ الصدور میں بھی یہ نظم درج ہے اس سے راوندی کی طرف اسکا انتساب صحیح سمجھا جاسکتا ہے لیکن راحۃ الصدور میں شاعر کا نام درج نہیں، ممکن ہے کہ کسی دوسرے شاعر کا ہو لیکن ممدوح طغرل بن ارسلان نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ اس کا قتل راحۃ الصدور کی تالیف سے دس سال سے کچھ پہلے ہوجاتا ہے نظم میں ارسلان کے ساتھ ہفت سلطان آیا ہے گویا اس سے پہلے اس خاندان میں سات سلطان گزر چکے ہیں، یہ واقعہ غلط ہے اس لیے کہ اس سلطان سے پہلے تیرہ[۱۳] سلطان گزر چکے ہیں۔

امریکا کے عجائب خانوں میں ہماری تہذیب سے متعلق نہ جانے کتنے مخطوطات ہیں جن کا احاطہ ایک مقالہ تو کیا متعدد کتابیں بھی نہیں کرسکتیں، ہمارا منشا موضوع کی اہمیت اور اس کی وسعت کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانا ہے۔

شیخ الرئیس کی تفسیر سورۂ اخلاص

از

ڈاکٹر سید غیاث الدین محمد عبدالقادر ندوی لکھنؤ

حسین ابن عبداللہ حسن ابن علی ابن سینا ابو علی معروف بہ شیخ الرئیس ابن سینا (ولادت افشنہ (جوار بخارا) ۳۷۰ھ/۹۸۰ء وفات ہمدان ۴۲۸ھ/۱۰۳۷ء) کی ذات محتاج تعارف نہیں ہے۔ امام طب کی حیثیت سے ان کی تاریخی اور فنی حیثیت قدماء کے یہاں بھی مسلم ہے اور طب جدید کے حاملین بھی ان کو سند کی حیثیت دیتے ہیں چنانچہ ان کی شاہکار تصنیف "القانون فی الطب" بعد کے اطبائے عرب کے لیے استناد اور حوالے کی دستاویز کی حیثیت سے مسلم رہی اور دوسری طرف اس کا انگریزی ترجمہ CANON OF MEDICINE ایک مدت تک مغرب کی طبی درسگاہوں کے نصاب میں داخل رہا اور آج بھی ایک مستند کتاب کی حیثیت سے مقبول ہے۔

طب کے علاوہ شیخ کا دوسرا اہم میدان فلسفہ رہا اس لیے ان کو عالم عرب کا عظیم فلسفی بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ شیخ نے ارسطو کے فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور نو افلاطونی کا بھی اثر قبول کیا تھا، ان کی تصنیف "الحکمۃ المشرقیۃ" ان کے ذاتی فلسفہ کی آئینہ دار ہے۔ ان کے علاوہ ۱۸ جلدوں میں "کتاب الشفا" اسی فن کی شاہکار تصنیف ہے۔ علم النفس میں ان کا ایک مشہور قصیدہ بھی ہے، جس کا مطلع ہے:

ہبطت الیک من المحل الارفع   ورقاء ذات تعزز وتمنع

اتری تیری طرف بڑے اونچے مقام   ایک فاختہ ناز نخرے والی

مجموعی طور پر شیخ نے طب و فلسفہ وغیرہ علوم میں سو سے زائد تصانیف چھوڑی ہیں۔ ان کی بعض تصانیف علوم لغت و دینیات سے متعلق بھی ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان کا بڑا ذخیرہ نایاب ہے۔

تکمیل الطب کالج لکھنؤ کے کتب خانہ میں محفوظ مخطوطہ (نمبر کتاب 05/M/A نمبر اندراج 1512) "الجواھر النفیس فی شرح ارجوزۃ شیخ الرئیس" میں شارح ارجوزہ موسیٰ بن ابراہیم بن موسیٰ المتطبب نے اپنے مقدمہ میں شیخ کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے بعض غیر معروف تصانیف کا بھی ذکر کیا اور فہرست کے آخر میں تحریر کیا ہے:

وغیر ذالک فی الاصول	علاوہ ازیں ان کی کتابیں اصول
والفروع و فی علم الحدیث	و فروع اور علم حدیث میں بھی ہیں اور
واخبرنی بعض الاشیاخ	مجھ سے کسی بزرگ نے بتایا کہ انہوں
انہ قد رأی لہ تفسیراً	نے ان کی تفسیر سورۂ فاتحہ دیکھی جو
علی سورۃ الفاتحۃ کان ضخیما۔	ضخیم تھی۔

مولانا شبیر احمد عثمانی نے حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ قرآن کے حواشی میں تفسیر معوذتین کے ضمن میں ابن سینا کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"ان دونوں سورتوں کی تفسیر میں علماء و حکماء نے بہت کچھ نکتہ آفرینیاں کی ہیں۔ حافظ ابن قیم، امام رازی، ابن سینا، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے بیانات درج کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔"

حاجی خلیفہ نے کشف الظنون (۵ : ۳۰۸ - ۳۰۹) میں شیخ کی تصانیف کی ایک جامع فہرست درج کی ہے جس میں تفسیر آیۃ النور، تفسیر سورۂ سبح اسم، تفسیر سورۂ المعوذتین مذکور ہیں۔

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے خدا بخش خاں مرحوم (۱۸۴۲-۱۹۰۸ء) کی تفسیر سورۂ فاتحہ و اخلاص ایک کتابچہ کی صورت میں ۱۹۹۶ء میں شایع کی ہے۔ یہ دراصل خدا بخش خاں مرحوم کا ایک لکچر ہے جو انہوں نے اس وقت دیا تھا جب وہ ہائی کورٹ حیدرآباد دکن کے چیف جسٹس تھے۔ اس لکچر کی قدیم اشاعت حیدرآباد میں بھی ہو چکی ہے۔ اس میں تفسیر سورۂ اخلاص کے ضمن میں (ص ۲۸) خدا بخش خاں مرحوم نے بیان کیا کہ "شیخ الرئیس نے اس سورۂ پاک کی ایک علٰحدہ تفسیر لکھی ہے"۔

اس کے بعد خاں صاحب (ص ۲۸ تا ۲۹) کہتے ہیں کہ:

"شیخ الرئیس کی تقریر یہ ہے کہ کل اعیانِ موجودات ساتھ مراتب ثلثہ یعنی ماہیت، وجود و تشخص کے متصف و ملتبس ہیں۔ اعیان ممکنہ میں وجود و تشخص محتاجِ غیر ہیں اور بلا وجود ماہیت وجود و تشخص کا موجود ہونا محال ہے۔ ایسی حالت میں دیکھنا چاہیے کہ وہ کس کا وجود ہے جو محتاجِ غیر نہیں۔ وہ وجود واجب الوجود ہے اور وہ وجود لذاتہ ہے نہ لغیرہ۔ کیونکہ اعیانِ ممکنہ میں وجود غیر ماہیت ہے اور ذات واجب الوجود میں وجود عین ماہیت ہے۔ لوازم اور اضافات انتسابی سے ہر چیز کی ہویت پہچانی جاتی ہے اور چونکہ ہویت اوتعالیٰ و تقدس کی لوازم اور انتساب غیر سے پہچانی نہیں جاسکتی اور ماہیت اس کی جنس و فصل سے مرکب نہیں ہے بلکہ وہ واحد محض اور بسیط محض ہے اس لیے او تعالیٰ و تقدس نے اپنی

ہویت محضہ اور ماہیت عین وجود کو لفظ اللہ سے تعبیر فرمایا۔

اعیان ممکنہ میں چونکہ مضمون کثرت اشتمال۔ اجناس و فصول۔ مادہ و صورت قوت و فعل۔ اشکال و الوان موجود ہیں اور او تعالیٰ و تقدس واحد محض ہے اور ان حدود سے بری اور منزہ ہے اور ان حدود کو احاطت اس پر نہیں ہے اس لیے اس نے اَللّٰہُ اَحَدٌ فرمایا۔

چونکہ باری جسم ہے نہ عرض ہے۔ نہ صاحب مکان نہ جہت و نہ صاحب ماہیت ہے بلکہ وجود اس کا عین ماہیت ہے اس لیے اَللّٰہُ الصَّمَدُ فرمایا۔

چونکہ خداوند تعالیٰ و تقدس مبداء فیاض وجود حقیقی ہے اور مصدر کل اشیاء ہے جو محتاج مادہ نہیں پس وہ متولد نہیں ہو سکتا اور جب متولد نہیں تو کسی کا والد بھی نہیں اس لیے لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ فرمایا۔

خداوند تعالیٰ و تقدس ہویت محضہ اور وجود محض رکھتا ہے اور ہویت اس کی اعتبار غیر سے پہچانی نہیں جاسکتی کیونکہ وجود اس کا عین ماہیت ہے۔ خود نہ جوہر ہے، نہ جسم ہے، نہ محدود بزمان ہے، نہ بمکان تب لامحالہ یہ بات حاصل ہوئی کہ اس کا کوئی برابر و ہمسر نہیں اس لیے لَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ" فرمایا"۔

خدا بخش مرحوم نے شیخ کی تفسیر سورۂ اخلاص کس صورت میں اور کہاں دیکھی اس کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ اگر تلاش و جستجو کے بعد شیخ کے رسائل تفسیر کا پتہ چل جائے یا ان کی کسی قدر تفصیلات ہی معلوم ہو جائیں تو خزانۂ تفسیر میں ایک قیمتی اضافہ یقینی ہو جائے۔

اخبار علمیہ

اردو زبان و ادب کے فروغ و ترقی کے لیے پاکستان کے ممتاز ادارہ مقتدرہ قومی زبان کے ترجمان ماہنامہ اخبار اردو سے اس کی سرگرمیوں کی خبر برابر ملتی رہتی ہے اس کے بعض تازہ شماروں سے معلوم ہوا کہ گزشتہ دنوں مرزا غالب کی ولادت کے دو سو سالہ جشن پر اس نے غالب کی خاندانی پنشن اور دیگر امور کے نام سے ایک کتاب شایع کی، جس میں فارسی و انگریزی زبان میں ۵۶ اسرکاری اسناد و دستاویز اصل متن و ترجمہ کے ساتھ یکجا کیے گئے ہیں غالب کی پنشن کے حصول کی، اس کی کوششوں کے گواہ یہ اوراق پنجاب آرکائیوز، دہلی آرکائیوز اور انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ تھے اندازہ ہے کہ غالب پر یہ کتاب اہم تحقیقی اور سوانحی حوالہ کی شان رکھتی ہے آزادی کے پچاس سالہ جشن کے موقع پر بھی ادارہ نے لسانیات اور زبان و ادب کی متعدد مفید کتابیں مثلاً "پاکستانی اردو کے خدوخال" اردو کا صوتی نظام "علم عروض اور اردو شاعری" پاکستان کی لوک داستانیں" اور ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی فرہنگ مشترک بھی شایع کیں، آخر الذکر میں افغانستان، ایران، پاکستان، ترکی اور مرکزی ایشیا کی ریاستوں میں بولی جانے والی زبانوں کے ہم معنی الفاظ یکجا کیے گئے ہیں، اس لحاظ سے یہ انفرادی شان کی حامل ہے، کمپیوٹر سائنس کے متعلق ایک مفید مجموعہ مضامین "اطلاعیات" کے نام سے شایع کیا گیا ہے انکے علاوہ ایک مستقل منصوبہ کے تحت دنیا کی عظیم الشان کتابوں مثلاً ارسطو کی بوطیقا، ابن باجہ کی کتاب النفس، فرانسس بیکن کی منہاج جدید، اسپینگلر کی زوال مغرب اور آئزک نیوٹن کی بصریات وغیرہ بھی شایع ہو چکی ہیں، گو ان مطبوعات جدیدہ کی دید سے ہم ابھی تک محروم ہیں لیکن مقتدرہ کی ان قابل قدر خدمات پر ہدیہ تبریک و تحسین ضرور پیش کرتے ہیں۔

اسلام آباد پاکستان کا ایک اور علمی ادارہ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان ہے جس کا مقصد

پاکستان بلکہ برصغیر میں فارسی زبان و ادب کا فروغ ہے، اس کا سہ ماہی مجلہ "دانش" اپنے بلند پایہ مقالات و مضامین، ترتیب کی خوش سلیقگی اور طباعت کے حسن و دلکشی کی وجہ سے نمایاں ہے، اس مجلہ نے اپنے پچاس شمارے پورے کر لیے پچاسویں شمارہ میں علامہ اقبال پر ایک گوشہ خاص کیا گیا ہے، اس میں تصوف کے ایک نادر مخطوطہ میکدہ محبت کا تعارف بھی شامل ہے اس قابل قدر مجلہ سے بعض اہم کتابوں اور ہند و پاک میں فارسی زبان کے متعلق افراد اور اداروں کی سرگرمی سے بھی واقفیت ہو جاتی ہے اسی پچاسویں شمارہ میں محمد بن محمد زنگی بخاری کی بستان العقول فی ترجمان المنقول، ابونصر فارابی کی موسیقی کبیر اور دیوان غلام حیدری کے طبع و اشاعت کی خبر ملی، ترکی کے ڈاکٹر عبد الباقی گولپینارلی کی کتاب مولانا جلال الدین کے فارسی ترجمہ، استنبول یونیورسٹی کے فارسی مخطوطات اور کتابخانہ مینوی اور حکیم محمد موسیٰ امرتسری کے ذخیرۂ کتب کی فہرستوں کی طباعت کا بھی ذکر ہے مجلہ کے تازہ شمارہ ۵۱ سے معلوم ہوا کہ قائد اعظم یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں علامہ شبلی کی فارسی شاعری بحث و تحقیق کا موضوع ہے، ہم اس وقیع، مفید اور نفیس و دیدہ زیب مجلہ کی مزید کامرانیوں کی توقع رکھتے ہیں۔

علم و دانش کے سلسلہ میں ایک دلچسپ تجزیہ امریکہ کے سائنسی رسالہ SLEEP میں شایع ہوا ہے جس کے مطابق چند افراد پر عملاً اس طرح تجربہ کیا گیا کہ ان کو ایسے کمروں میں رکھا گیا جہاں رات اور دن کا فرق نہیں تھا، وقت کا اندازہ بھی ممکن نہ تھا، اس تجربہ میں ہر گھنٹہ میں تین منٹ ان کی ذہنی حالت کے مطالعہ کے لیے مخصوص کیے گئے بالآخر یہ ثابت ہوا کہ انسان کی قوت تفکیر و استنباط رات کے وقت سست ہو جاتی ہے، گو انسان خود کو شعور و احساس کے لحاظ مکمل بیدار ہی سمجھتا ہو لیکن اس ہوش و بیداری کے باوجود رات آنے پر سوچنے کی قوت کم ہو جاتی ہے اور صبح ہوتے ہی اس میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

ع۔ص۔

وفیات

مولانا شاہ عون احمد قادری

مولانا شاہ عون احمد قادری کی وفات کی خبر تاخیر سے ملی، ان کا تعلق پھلواری کے ایک مشہور علمی و دینی خانوادے سے تھا۔ ہندوستان کے جو مراکز اور خانقاہیں ہدایت و ارشاد اور سلوک و عرفان کے ساتھ ہی علم و فضل میں بھی شہرت و امتیاز رکھتی ہیں، ان میں ایک خانقاہ مجیبیہ بھی ہے جس کے مولانا شاہ عون احمد ایک بزرگ اور باوقار حاملِ شریعت و طریقت اور ممتاز عالم و فقیہ تھے، وہ جہاں دعوت و تبلیغ اور اصلاح و ارشاد کا فریضہ انجام دیتے تھے اور اس کے لیے ملک و بیرونِ ملک کے سفر بھی کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے مریدین و معتقدین کا وسیع حلقہ تھا، وہاں مسلم تنظیموں اور مسلم اداروں سے بھی وابستہ رہتے تھے اور مسلمانانِ ہند کی مشترکہ ملی و اجتماعی جدوجہد میں بھی حصہ لیتے تھے۔

جمعیۃ علمائے ہند سے برابر ان کا تعلق رہا، عرصہ تک وہ جمعیۃ علمائے بہار کے صدر اور مرکزی جمعیۃ علما کے نائب صدر رہے، مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن تھے، فقہ و افتا میں امتیاز کی وجہ سے امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ کے قاضی رہے اور برسوں قضا کی خدمت انجام دی، کئی مقامی علمی و تعلیمی اداروں کے علاوہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے بھی رکن تھے۔

شاہ صاحب نے اجمیر کے مدرسہ معینیہ میں تعلیم کی تکمیل کی، اس سے پہلے فرنگی محل لکھنؤ میں بھی تحصیل علم کر چکے تھے، ان کے اساتذہ میں معقولات و درسیات کے مشہور

فاضل مولانا حکیم محمد شریف مصطفےٰ آبادی، اعظم گڈھی بھی تھے جو ان کے جدِ امجد مولانا شاہ بدر الدین کے مریدِ خاص تھے، مولانا عون احمد صاحب کو اپنے عم بزرگوار مولانا شاہ محی الدین قادری امیر شریعت ثانی صوبہ بہار و اڑیسہ سے بیعت و خلافت ملی تھی۔

مولانا عون احمد کو قوتِ بیان کی طرح قوتِ تحریر بھی عطا ہوئی تھی۔ جب خانقاہِ مجیبیہ کا رسالہ "المجیب" شایع ہوتا تھا تو اس میں ان کے دینی و اصلاحی مضامین اور تحریریں بھی چھپتی تھیں، اپنے مرشد و مربی مولانا شاہ محی الدین قادری کے سوانح "محی الملت والدین" کے نام سے لکھے تھے، ایک اور کتاب "نعمت کبریٰ" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ دائمی کو ثابت کیا ہے، شعر و شاعری سے بھی مناسبت تھی، فارسی کے اچھے شاعر تھے۔

خانقاہِ مجیبیہ کے بزرگوں کا تعلق دار المصنفین سے بھی تھا اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تعلیم پھلواری میں بھی ہوئی تھی۔ یہاں کے لوگوں سے ان کے اور جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب کے خاص مراسم تھے، بنارس، اعظم گڈھ اور عظمت گڈھ وغیرہ میں مولانا عون احمد صاحب کے مریدین کی بڑی تعداد تھی، ان کی تربیت و تزکیہ کے لیے جب تشریف لاتے تو دار المصنفین میں بھی قدم رنجہ فرماتے، اپنے ایک صاحبزادے مولوی شاہ نصر احمد کو تصنیف و تالیف کی تربیت حاصل کرنے کے لیے یہاں بھیجا جو بڑے سنجیدہ، شائستہ، سعادت مند، حلیم اور صالح نوجوان اور اپنے والد بزرگوار کی تربیت کا نمونہ تھے، معارف میں ان کا ایک مضمون کئی قسطوں میں امام الحرمین پر نکلا تو اہل علم نے اسے بہت پسند کیا، مگر عین جوانی میں وفات پا گئے، ہم لوگ تعزیت کے لیے گئے تو شاہ عون احمد صاحب صبار و شکور کی عملی تفسیر بنے ہوئے تھے، دراصل ان کی

ذات شرافت، حسنِ خلق، لطف و شفقت، مہمان نوازی، خاکساری، سادگی، اخلاص، نیکی دینداری اور زہد و اتقا کا بے مثال نمونہ تھی۔

اِدھر کئی برس سے ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی، معذوری بڑھتی جاتی تھی بالآخر ۱۶؍ اپریل کو داعیِ اجل کا پیام آگیا، اللہ تعالیٰ علم و دین کے اس خادم اور پیکرِ حلم و شرافت کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے، آمین

مولانا ابو بکر اصلاحی

افسوس ہے کہ ۲؍ مئی کو جماعتِ اسلامی کے ایک ذمہ دار بزرگ اور اعظم گڈھ کے اطراف کے مشہور عالم مولانا ابو بکر اصلاحی صاحب نے داعیِ اجل کو لبیک کہا، مدرسۃ الاصلاح سے فراغت کے بعد انہوں نے ضلع بستی میں دینی تعلیم کی اشاعت اور درس و تدریس کی خدمت انجام دی، ۱۹۴۶ء میں مدرستہ الاصلاح آئے۔

راقم نے صرف و نحو اور فقہ کی بعض کتابیں ان سے پڑھیں، وہ جماعت کے بڑے سرگرم رکن تھے، اس لیے مدرسہ سے سبکدوش ہوکر اس کے تنظیمی کاموں میں لگ گئے، ان کی اچھی کارگزاری کی بنا پر جب جامعۃ الفلاح قائم ہوا تو اس کی ترقی و استحکام کا کام انہیں سپرد کیا گیا اور وہ عرصہ تک اس کے نیک نام ناظم و صدر مدرس رہے۔ اب علالت و معذوری کی وجہ سے سرائمیر میں اپنے گھر ہی رہتے تھے۔

دارالمصنفین بھی تشریف لاتے تھے، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی سے تعلق خاطر تھا۔ مولانا ابو بکر صاحب کی وفات سے جماعت اسلامی اپنے ایک اچھے اور مخلص کارکن سے محروم ہوگئی، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ آمین!!

مولانا شاہ حسن مثنی ندوی

یہ بھی پھلواری کے علمی و دینی خانوادے کے چشم و چراغ اور مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کے پوتے تھے جو ہندوستان کے مشہور عالم و واعظ اور تحریک ندوۃ العلما کے خاص رکن تھے، تقسیم کے بعد شاہ حسن مثنی صاحب پاکستان چلے گئے اور وہاں سے مہر نیمروز کے نام سے ایک مذہبی و ادبی رسالہ نکالا، اس میں وہ "چہ دلاور ست دزدے کہ بکف چراغ دارد" کے عنوان سے ایک مستقل کالم لکھتے جس میں ادیبوں کی چوریوں کا ذکر ہوتا جو بہت پسند کیا جاتا، ادب سے ان کو بڑا شغف تھا اور انکے ادبی و تنقیدی مضامین ان کے جوہر قابل ہونے کے غماز تھے۔ ان کا انتقال مارچ ہی میں ہوگیا تھا، لیکن پاکستان کی خبریں یہاں دیر سے پہنچتی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمتِ کاملہ سے نوازے، آمین!

منشی محمد حنیف صاحب

بمبئی کے خطوط سے منشی محمد حنیف صاحب کے انتقال کی خبر معلوم کرکے بڑا صدمہ ہوا، ان کی جوانی مدرستہ الاصلاح سرائمیر کی خدمت میں گزری، پھر بمبئی گئے، اللہ نے کاروبار میں بڑی برکت دی۔ ہر طرح کی فارغ البالی کے باوجود نہ دین سے شغف میں کمی آئی اور نہ مدرستہ الاصلاح کی محبت میں فرق آیا۔ اس کی ترقی و فلاح کے لیے برابر فکرمند رہتے۔ دارالمصنفین سے بھی خاص لگاؤ تھا، اس کے لائف ممبر تھے، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب سے بڑے مخلصانہ روابط تھے، ان حضرات کی بمبئی اور اپنے گاؤں آندھی پور میں پُرتکلف دعوتیں کرتے، مجھ پر بھی بڑی شفقت فرماتے۔ اب ایسے شریف، بامروت، وضع دار اور مخلص لوگ نایاب ہوتے جارہے ہیں، اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت کرے اور متعلقین و اعزہ کا غم زائل کرے!!

"ض"

ادبیات

غزل

از پروفیسر جگن ناتھ آزاد

گلوں میں تازگی شمعوں میں تابانی نہیں ہوگی
نگاہوں میں جو تیری جلوہ سامانی نہیں ہوگی

وفا کی راہ میں اے دل! ذرا ثابت قدم رہنا
یہ ہے وہ راہ جس میں کوئی آسانی نہیں ہوگی

ذرا میری پریشانی کا تو مجھ سے بیاں سُن لے
پھر اس کے بعد کوئی بھی پریشانی نہیں ہوگی

تعجب ہے چمن سے کوئی لے اٹھی نہیں اب تک
نوا میری چمن والوں نے پہچانی نہیں ہوگی

خبر بھی ہے تجھے ظالم! اگر لب سی لیے میں نے
تو پھر تیری ہی محفل میں گُل افشانی نہیں ہوگی

کہیں تو میرے نغموں کو ترستا ہی نہ رہ جائے
مجھے تو اس خموشی پر پشیمانی نہیں ہوگی

نگاہیں منتظر ہیں اس گھڑی کی جب زمانے میں
جہاں گیری نہیں ہوگی جہاں بانی نہیں ہوگی

یہیں پر ختم ہے عصر رواں، تیری غزل خوانی
یہاں جب ہم نہیں ہونگے غزل خوانی نہیں ہوگی

مزاج بزم ہستی ہو اگر کچھ اور بھی برہم
مجھے آزاد! اس پر کوئی حیرانی نہیں ہوگی

اشعار

پہلے نگاہِ شوق تو پیدا کرے کوئی
پھر تجھ کو دیکھنے کی تمنا کرے کوئی

اٹھیں گے زندگی کے حجابات خودبخود
یہ شرط ہے کہ دیدۂ دل وا کرے کوئی

اس سے بھی کچھ سوا ہوں جو دل کی بلندیاں
کیوں جا کے طور ہی پہ تقاضا کرے کوئی

مطبوعات جدیدہ

امام حسن بصریؒ اور ان کی تفسیری خدمات از جناب احمد اسمٰعیل البسیط، مترجم جناب مولانا عبدالقیومؒ متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گردپوش، صفحات ۳۳۱، قیمت ۵۹ روپے پتہ: اسلامک بک فاؤنڈیشن، ۱۷۸۱، حوض سوئی والان، نئی دہلی ۲...۱۱۔

حضرات تابعینؒ علم و عمل اور فضائل و محاسن کا بہترین نمونہ تھے، دینی علوم کی حفاظت و اشاعت اور قرآن و حدیث سے مستفاد علوم کی تاسیس ان حضرات کا سب سے اہم کارنامہ اور قدر مشترک ہے، ان جامع علوم و کمالات ہستیوں میں سرفہرست امام حسن بصریؒ کی ذات گرامی ہے، اکثر تصوف اور علم باطن کے سرچشمہ کی حیثیت سے ان کے حقیقی مقام کا تعین عرفان و حقیقت کے دائرہ میں کیا جاتا ہے، حالانکہ سید التابعین مجمع العلوم تھے، زیر نظر کتاب میں اردن کے ایک فاضل محقق نے ان کی تفسیری شان کو موضوع بنایا اور بعض اہم نکات مثلاً امام صاحب کے زمانہ تک علم تفسیر کے ارتقائی مراحل خود ان کا اسلوب تفسیر اور تفسیر بالاثر اور بالرائے کے متعلق ان کے رویہ وغیرہ کو پیش نظر رکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان کی تفسیر کا بہت کم حصہ رائے پر مبنی ہے زیادہ حصہ تفسیر بالماثور ہی ہے، ایک فصل میں مسائل و احکام کی تخریج و ترجیح پر مفصل بحث ہے اس سے تابعین کے عہد میں فہم قرآن کی سادگی اور بعد کے مختلف علمی و فکری اثرات سے پاکی صاف ظاہر ہے، آیت صدقات میں فی سبیل اللہ کے ضمن میں امام بصریؒ کی یہ رائے ہے کہ زکوٰۃ کا

مال سڑکوں اور پلوں کی تعمیر نیز فلاحی منصوبوں پر خرچ کرنا جائز ہے، ناسخ و منسوخ اور اسباب و مکان نزول کے علاوہ مشرکین سے مصافحہ، خطبۂ جمعہ، قراءۃ فاتحہ خلف الامام اور نماز کے اندر کلام جیسے فقہی مسائل کے متعلق بھی ان کی رائیں تفسیر سے ظاہر ہیں، امام صاحب کے سوانح اور ان کے عہد کے علمی، مذہبی اور سیاسی ماحول کی بھی تصویر کشی کی گئی ہے اس لحاظ سے یہ اپنے موضوع پر عمدہ کتاب ہے، البتہ ترجمہ زیادہ رواں اور سلیس نہیں، بعض تعبیرات مثلاً "زہد و تقویٰ کی تحریک" اور "مدرسہ زہد" وغیرہ درست نہیں کہی جاسکتیں اور یہ تو بڑا سخت دعویٰ ہے کہ "امام بصریؒ کے مدرسہ زہد کو فکر اسلامی کی تاریخ میں وہ مقام حاصل ہوگیا جہاں تک نہ تو ان سے پہلے گزر جانے والے مفکرین اسلام پہنچ سکے اور نہ ان کے معاصرین"۔ کتابت کی غلطیاں بھی ہیں۔

تحقیق سے تحریف تک از جناب مولانا انیس احمد فلاحی مدنی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، صفحات ۳۳۲، قیمت ۸۰ روپے، پتہ: حیات نو جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڈھ، یوپی۔

مسئلہ رجم کے سلسلہ میں ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی کی کتاب حقیقت رجم کا ذکر آچکا ہے، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی اور نسبتاً زیادہ مفصل ہے، کتاب کا اصل موضوع نام سے ظاہر ہے، مولانا عنایت اللہ سبحانی نے اپنی متنازعہ کتاب میں چند اصول وضع کیے تھے اور ان کی روشنی میں اس مسئلہ کے ما لہ و ما علیہ سے بحث کی تھی اس کتاب میں ان کو بے اصل و بنیاد بتا کر بعض شبہات اور احادیث و واقعات رجم پر اعتراضوں کا حتی المقدور علمی و تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے، البتہ رد و دفاع میں جابجا لہجے کی تندی و ترشی کا احساس ہوتا ہے، اس سے گریز کیا جاسکتا تھا، تعذیب فی القبر کے سلسلہ میں

یہ جملہ کہ "یہ حضرت صدیقہؓ کی غلط فہمی تھی" بھی خلاف احتیاط ہے۔

تلوک چند محروم شخصیت اور فن از جناب ڈاکٹر زینت اللہ جاوید، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد، صفحات ۲۷۶، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

استاذ فن اور قادر الکلام شاعر جناب تلوک چند محروم کے کلام کا وصف خاص لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم قرار پایا تھا، غزل، نظم اور رباعی تینوں اصناف سخن ان کی بدولت بلند پایہ مضامین و خیالات سے آراستہ ہوئے، ایک زمانہ میں کلام محروم کی دھوم تھی، مگر موجودہ عصر تحقیق میں ان کے کلام و مقام سے شایان شان اعتنا کم کیا گیا، یہ کتاب اسی کمی کی تلافی اور مطالعہ و تحقیق اور سلیقہ و محنت کا عمدہ نمونہ ہے، عہد، ماحول اور سوانح کے علاوہ جدا جدا ابواب میں ان کی شاعری پر مفصل بحث کی گئی ہے لائق مولف کے نزدیک محروم اصلاً نظم کے شاعر ہیں، لیکن اس سے غزل اور رباعیات میں ان کے مقام بلند کی تخفیف نہیں ہوتی، البتہ حیات محروم کی زبان و بیان پر اور توجہ کی ضرورت تھی، "دائرہ فکر و احساس میں اپنی شاعری کا بنیادی پتھر ہاتھوں میں لیے منصۂ شہود پر آئے"، "آسمان ادب میں خورشید کاری کی" اور "فنی کارنامہ کا داخلی، خارجی ماحول" جیسے عنوانات بھی محروم کے سوانح میں زیب نہیں دیتے، پیش لفظ محروم کے قابل فخر فرزند جناب جگن ناتھ آزاد کے قلم سے ہے۔

مت سہل ہمیں جانو از جناب انور ظہیر خاں، متوسط تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت بہترین، مجلد، صفحات ۱۷۲، قیمت ۱۲۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

اردو میں خاکہ نگاری کی مسلسل و مستحکم روایت میں زیر نظر کتاب ایک تازہ اور بڑا خوشگوار اضافہ ہے، لائق خاکہ نگار اس صنف کی باریکی، نزاکت اور پیچیدگی سے بخوبی واقف ہیں، جس کا اظہار انہوں نے شروع میں مہارت و سلیقہ سے کیا ہے، ان کو احساس ہے کہ ' خاکہ نگاری بہت آسان ہے اور مشکل بھی بہت' چنانچہ انہوں نے محض حالات و واقعات اور اپنے مشاہدات و تاثرات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ شخصیت کے ذہن و مزاج اور کردار و نفسیات تک رسائی کی کامیاب کوشش کی ہے' علی سردار جعفری، ظ انصاری، اختر الایمان' باقر مہدی، حسن نعیم، عزیز قیسی' اور ندا فاضلی کے ہفت رنگ خاکوں پر مشتمل یہ مجموعہ ممکن ہے قاری کے سامنے ان کی ایک مکمل اور واضح تصویر پیش کرنے سے قاصر ہو تاہم پر لطف نثر، بے باکی اور رمز و کنایہ کی شوخی اور سب سے بڑھ کر خاکہ نگاری کی تکنیکی مہارت سے یہ حد درجہ جاذب اور دلچسپ بن گیا ہے، چھوٹے چھوٹے خوبصورت جملے اس مجموعۂ مضامین کی جان ہیں' جن سے گو بصیرت نہ ملے مسرت ضرور حاصل ہوتی ہے، شخصیات کی نباضی اور نفسیاتی مطالعہ میں گہرائی ہے، البتہ شبیہ نویسی میں تکلف اور آورد کا احساس بھی ہوتا ہے' حلیہ نگاری جس مقصد کے تحت کی گئی ہے وہ شاید پورا نہ ہو سکے' مذہب اور معتقدات کا مرحلہ آسان نہیں خصوصاً جب ذکر اصطلاحی ماڈرن اور روشن خیالوں کا ہو، چنانچہ احتیاط کے باوجود مخالف طبقہ کے لیے دیمک زدہ قدروں سے لپٹے ہوئے لوگ' بیمار ذہن' زبان کے طعنے و تشنے' (والے) فرسودہ قدروں' (والے) جیسے جملے آہی گئے ہیں، اس کے بغیر بھی روشن خیالی کی لو مدھم نہ ہوتی۔

ع۔ ص۔